فلسفۂ دعا۔ از پروفیسر افضل احمد صاحب عارف ایم اے، صفحات ۱۹۲، کتابت و طباعت بہتر، ناشر مکتبہ رشیدیہ، غلہ منڈی منٹگمری، ہندوستان، مکتبۂ علم و ادب دیوبند۔ قیمت للعر

عبد و معبود کے رشتہ کو جو چیزیں جوڑتی ہیں ان میں ایک موثر جذبہ دعا بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ دعوت و تبلیغ کیساتھ تمام انبیاء، اور خصوصیت سے سرور عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت رہی ہے کہ انھوں نے سراء و ضراء، نعمت و مصیبت ہر حال میں خدا ہی کو پکارا ہے، قرآن و حدیث میں جو دعائیں اگلے انبیاء، اور ان کے حواریین اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی زبان سے منقول ہیں، ان میں ایک طرف توحید کا اعلیٰ تصور، آخرت کا پرشور احساس اور خوف و رجا کی بہترین آمیزش ملے گی، دوسری طرف آپ کی زندگی کے ہر موقع و محل اور نازک سے نازک انسانی احساسات و جذبات کی ترجمانی ملے گی، تیسری طرف ان کے پڑھنے سے آپ کے ایمان میں روشنی اور قلب و دماغ میں جلا آئے گی اور سوز و گداز پیدا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دعا سے اس سے زیادہ خوش ہوتا ہے جتنا کہ ایک باپ یا ماں کا دل اپنے ننھے بچے کی فرمائش سے باغ باغ ہو جاتا ہے، جس کسی کو دعوت کے ساتھ دعا کی دولت بھی ہاتھ آجائے اس نے واقعی بڑی دولت پائی۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

پروفیسر افضل صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس موضوع پر ایک عمدہ کتاب لکھ دی، یہ کتاب بار بار زبان دل اور چشم پرنم کے ساتھ پڑھنے کے لائق ہے۔

م، ج

جلد ۹۰ ماہ جمادی الاول ۱۳۸۲ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۶۲ء عدد ۴

مضامین

شذرات

اردو زبان کے مشہور خدمت گذار اور نامور صاحب قلم ڈاکٹر سید محی الدین زور قادری کی وفات دنیائے اردو کا بڑا سانحہ ہے، انھوں نے علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے اردو زبان وادب کی بڑی خدمت کی، وہ دکن کے مولوی عبدالحق اور دکنیات کے خصوصیت کے ساتھ بڑے ماہر تھے، قدیم دکھنی اردو کی بہت سی نادر کتابیں انھوں نے شائع کیں، ان کا سب سے بڑا کارنامہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد ہے، اس ادارہ نے اردو زبان وادب کی جو گوناگوں خدمات انجام دیں، اس کی مثال اردو کے اسکی عمر کے اداروں میں نہیں مل سکتی، اس کی . . . حیثیت دکن میں وہی ہے، جو شمالی ہند میں انجمن ترقی اردو ہند کی ہے اور آج اندھرا پردیش میں اردو کا وجود اور اس کا وقار اسی ادارے کے دم سے قائم ہے، ڈاکٹر زور کی مستقل تصانیف اور ان کی مرتب اور شائع کردہ کتابوں کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہوگی، وہ حیدرآباد کے ایک خانوادۂ مشائخ سے تعلق رکھتے تھے، اسی نسبت سے اپنے نام کے ساتھ قادری لکھتے تھے، اور اس سلسلہ کو انھوں نے قائم بھی رکھا تھا، چنانچہ ان کے بڑے صاحبزادے ان کی خاندانی خانقاہ کے سجادہ نشین ہیں، مگر ان کی علمی وادبی شہرت نے ان کی اس حیثیت کو اتنا چھپا دیا تھا کہ اس کا علم بھی بہتوں کو نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے،

لسانی کمیٹی کی رپورٹ پر اتنی بحث ہو چکی ہے، خصوصاً حیات اللہ صاحب انصاری اور قاضی عدیل صاحب عباسی ان کی موافقت اور مخالفت میں اتنا لکھ چکے ہیں کہ اس کا ہر رخ سامنے آگیا ہے،

کوئی پہلو تشنہ باقی نہیں ہے، اتنا سب کو تسلیم ہے کہ یہ رپورٹ بہت ناقص ہے، اس میں اردو کے بعض ضروری مسائل کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے، اور اردو کے مطالبات سے اس کی سفارشوں کو کوئی نسبت نہیں ہے، اس لیے اردو کے تمام اخبارات حتی کہ انجمن ترقی اردو ہند کے ترجمان ہماری زبان تک نے جس کی پالیسی اس کی ذمہ داریوں کی بنا پر نسبتہً نرم اور معتدل ہے، اس رپورٹ کی مخالفت کی ہے، اس لیے موجودہ شکل میں وہ قطعاً ناقابل قبول ہے، لیکن ایک بڑا سوال یہ بھی ہے کہ اردو کے موجودہ مخالف حالات میں اس کو بالکل رد کر دینا اردو کے لیے مفید ہوگا، یا بعض ضروری ترمیموں کے قبول کر لینا،

اس حقیقت سے ہر شخص واقف ہے کہ آزادی کے بعد کچھ ہندوستان کی تقسیم کے اثرات اور کچھ پراچین بھارت کی احیائی ذہنیت نے اردو کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اور اس کو بھی پاکستان کا ہمزاد تصور کیا جاتا ہے، اور اس کی مخالفت ہندوستان کا ایسا قومی مسئلہ بن گئی ہے، جس میں کسی جماعت کا استثنا نہیں ہے، ایک مختصر جماعت کو چھوڑ کر جس کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے، مرکز سے لیکر صوبوں تک اور ہندو مہا سبھا اور جن سنگھ سے لیکر کانگریس تک سب کے جذبات اردو کے بارہ میں تقریباً یکساں ہیں، اور ہندوستان کی بہت بڑی اکثریت اردو کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، کچھ منصف مزاج اور حق پسند ضرور ایسے ہیں جو اردو کو ختم کرنا پسند نہیں کرتے، لیکن انکی تعداد اتنی کم ہے کہ وہ کبھی کبھی اردو کے حق میں کلمۂ خیر کہہ دینے کے علاوہ عملاً اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے، حتی کہ پنڈت جواہر لال نہرو تک اس معاملہ میں بے بس ہیں، ان حالات میں حکومت سے زیادہ توقع رکھنا عبث ہے، اگر وہ ہمت کر کے اردو کے لیے کچھ کرنا بھی چاہے تو بہت آگے نہیں جا سکتی اور ملک کے متفقہ جذبات کو نظرانداز کر کے اپنے کو خطرہ میں نہیں ڈال سکتی۔

ان حالات میں چارۂ کار کیا ہے، زور وقت سے اردو کے حقوق منوانے کا سوال ہی نہیں، اس راہ میں جو دشواریاں بلکہ خطرات ہیں، ان سے ہر شخص واقف ہے، عدالت سے فیصلہ کرانے میں بھی بڑی طوالت اور پیچیدگیاں ہیں، محض زبانی احتجاج اور حکومت کو برا بھلا کہنے سے کچھ حاصل نہیں، جس کا تجربہ ۱۳ سال سے ہو رہا ہے، اس لیے اگر جذبات سے قطع نظر کر کے محض اردو زبان کے مفاد کے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر غور کیا جائے تو مناسب صورت یہی نظر آتی ہے کہ کمیٹی کی سفارشوں کو ضروری ترمیموں کے ساتھ منظور کر لیا جائے، کمیٹی کی رپورٹ حرف آخر تو ہے نہیں کہ اس میں ترمیم کی مطلق گنجائش نہ ہو، اس میں ایک اہم مسئلہ اسلامی مکاتب کا بھی ہے، کمیٹی کی رپورٹ پر غور کرنے کے لیے انجمن ترقی اردو ہند کی مجلس عاملہ کا جلسہ عنقریب ہونے والا ہے، حیات اللہ صاحب انصاری اور عدیل عباسی صاحب دونوں انجمن کے رکن ہیں، قاضی صاحب دینی تعلیم کونسل اتر پردیش کے سکریٹری بھی ہیں، اس لیے وہ اس کی نمایندگی بھی کر سکتے ہیں، انجمن کو جمعیۃ کے تعلیمی بورڈ کے نمایندے کو بھی مدعو کر لینا چاہیے، یہ تینوں مل کر جو فیصلہ کر دیں اس کو مان لیا جائے، اور باقی حقوق کے لیے جد و جہد جاری رکھی جائے،

مسلم یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر مسٹر بدرالدین طیب جی کے متعلق ایک طبقہ کی رائے ہے کہ وہ حکومت کے آدمی ہیں، اور ان کو تعلیمی مسائل کا کوئی تجربہ نہیں ہے، اس لیے آزادی سے یونیورسٹی کو نہ چلا سکیں گے اور خطرہ ہے کہ حکومت کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ نہ بن جائیں لیکن ابھی اس بارہ میں کوئی فیصلہ کرنا قبل از وقت ہے، وہ ایک بڑے دادا کے پوتے اور خود بھی ایک لائق اور روشن دماغ مسلمان ہیں، انھوں نے حال میں یونیورسٹی کی روایات کے متعلق جو تقریر کی ہے وہ بھی امید افزا ہے، اس لیے توقع یہی رکھنی چاہیے کہ وہ یونیورسٹی کی روایات و خصوصیات اور ملک کے نئے تقاضوں دونوں کا لحاظ رکھیں گے اور ان کا دور یونیورسٹی کے لیے مفید ثابت ہوگا،

مقالات

ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

از جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم اے

(۷)

فیروز شاہ کا تصادم صوفیہ سے فیروز شاہ تغلق شریعت کا لحاظ ہر حال میں رکھتا، اور اس نے اس کی پاسبانی کر کے نہ صرف علماء، بلکہ صوفیہ کی بے راہ روی کو بھی سختی سے روکا، اس کے عہد میں ایک بزرگ احمد بہاری تھے، جو دہلی میں آکر رہ گئے تھے، ان کے بہت سے مریدین تھے، فیروز شاہ کا بیان فتوحات فیروز شاہی میں ہے کہ ان کے مریدین دہریے تھے، جو احمد بہاری کو خدا سمجھتے اور کہا کرتے تھے کہ دہلی میں خدا طلوع ہوا ہے، اور خود احمد بہاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ باتیں کرتے تھے، اسی لیے فیروز شاہ نے ان کے پاؤں میں زنجیر ڈلوا کر اپنے سامنے بلوایا، اور قید کر دیا، ان کے مریدین کو ادھر ادھر مختلف شہروں میں بھیجکر منتشر کر دیا، ان کے ایک دوست شیخ عز کاکوی بھی تھے، ان پر بھی شطحیات کا الزام آیا اور علماء کے فتوی پر ان کو قتل کر دیا گیا، فتوحات فیروز شاہی میں احمد بہاری اور شیخ کاکوی کے

قتل کا ذکر نہیں ہے، لیکن حضرت مخدوم الملک شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ احمد بہاری اور شیخ کاکوی دونوں قتل کر دیے گئے، جس سے مخدوم الملک کو بڑا دکھ ہوا، وہ دونوں کو توحید کے اسرار و رموز کا واقف کار اور ترک و تجرید کا حامل سمجھتے تھے، اور ان کی باتوں کو عالم دیوانگی پر محمول کرتے تھے، اسی لیے ان کو ان دونوں کے قتل کی خبر ملی تو فرمایا کہ جس شہر میں ایسے بزرگوں کا خون بہایا جائے، تعجب ہے اگر وہ آباد رہے، ان کے حامیوں کا خیال ہے کہ فیروز شاہ کے بعد دہلی تیمور کے ہاتھوں جو برباد ہوئی، وہ گویا ان ہی بزرگوں کا خون رنگ لایا تھا،

فیروز شاہ کے عہد میں عین الملک ماہرو کے غلام نے صوفی بن کر اپنے مریدوں کو تاکید کی کہ میں اناالحق کہوں تو تم سب بلند آواز سے توئی توئی کہو، اس نے اپنے مریدوں کے لیے ایک رسالہ بھی لکھا، فتوحات فیروز شاہی میں ہے کہ اس کو بھی پابہ زنجیر طلب کر کے سخت سزا دی گئی، فتوحات فیروز شاہی میں اس کے قتل کا بھی ذکر نہیں لیکن وہ بھی علماء کے فتویٰ پر قتل ہوا،

فیروز شاہ کے زمانے میں مشائخ کی قبروں کی زیارت کے سلسلے میں بہت سی بدعتیں بھی پیدا ہو گئی تھیں، ان کے مزارات کی زیارت کے لیے عورتیں، پالکیوں، گھوڑوں اور خچروں پر سوار ہو کر جاتیں، ان کے پیچھے اوباش لگ جاتے، جو طرح طرح کی مذموم حرکتیں کرتے، فیروز شاہ نے عورتوں کو مزاروں پر جانے سے بالکل روک دیا، اور اس حکم کی خلاف ورزی پر سخت سزائیں دیں،

حضرت مجدد الف ثانیؒ اور جہانگیر

مغل بادشاہوں کے دور میں جہانگیر اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے درمیان کچھ دنوں ضرور اختلاف رہا، عالمگیر کے عہد میں حضرت سرمد کی شہادت کا المناک حادثہ بھی ضرور پیش آیا لیکن ان دونوں واقعات کو چھوڑ کر ہر موقع پر مغل حکمراں صوفیۂ کرام کے آگے سر تسلیم خم کرتے رہے،

پہلے ذکر آیا ہے کہ جہانگیر میں بڑی مذہبی حمیت و غیرت تھی، لیکن اسی کے ساتھ اس سے دوناقابل

اعتراض باتیں سرزد ہوتی رہیں، ایک تو وہ پیالہ کش رہا، دوسرے اسلام کے حکم کے خلاف اس کے حرم میں ایک وقت میں چار سے زیادہ بیگمات رہیں، اور یہ لکھتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ میں پیالہ کشی اور کثرت ازدواج شاہانہ لوازم میں داخل ہو گئی تھیں، بلبن، فیروز شاہ تغلق اور بابر جیسے دیندار بادشاہوں کی مجلسوں میں بھی کچھ دنوں تک شیشہ و ساغر کا شغل رہا، جہانگیر تو علانیہ شراب نوشی کرتا رہا، بلکہ اپنی طرح شہزادہ خرم کو بھی شراب پینے کے لیے آمادہ کرتا، اپنے دسویں سال جلوس میں ایک موقع پر صاف گوئی سے کام لے کر لکھتا ہے:-

"وہ (یعنی خرم) ۲۴ سال کا ہو گیا تھا، اس کی شادی بھی ہو گئی تھی، اس کے بچے بھی ہو گئے تھے لیکن اب تک اس نے شراب پی کر اپنے کو آلودہ نہیں کیا تھا، آج کے روز وہ وزن کیے جانے والا تھا، (یعنی اس کی سالگرہ تھی) میں نے اس سے کہا کہ بابا صاحب! تم اولاد والے ہو گئے ہو، بادشاہ اور شہزادے شراب پیا کرتے ہیں، آج تمہارا جشن وزن ہے، تو تمہارے ساتھ میں بھی شراب پیتا ہوں، اور تم کو اجازت دیتا ہوں کہ جشن کے مواقع پر نوروز اور بڑی بڑی مجلسوں میں شراب پیا کرو لیکن اعتدال قائم رہے۔"

جہانگیر آخر آخر وقت تک شراب پیتا رہا، لیکن جمعرات، جمعہ کی رات اور اتوار کو نہیں پیتا، جمعرات اس کی تخت نشینی کا دن تھا، جمعہ کی رات کو وہ متبرک رات سمجھتا، اور اتوار اکبر کی پیدائش کا دن تھا، اسی طرح اس کے حرم میں چار سے زیادہ بیویاں رہیں، اکبر نے اپنے عہد حکومت میں اس کی جو شادیاں رچا کر اپنے سیاسی اغراض پورے کیے، ان میں چھ راجپوت شہزادیوں سے ہوئیں، جہانگیر نے خود اپنے عہد حکومت میں تین نکاح کیے، ممتاز اور باثر ہندو اور مسلمان منصبداروں نے اپنی اپنی لڑکیوں کو اس کے حرم میں بڑی بڑی امیدوں کے ساتھ داخل کیا، اور خود راجکماریاں اور امیرزادیاں بھی ملکہ بننے کے شوق میں سوکنوں کا خیال کیے بغیر حرم میں داخل ہوتی رہیں، اسلامی قانون کی یہ خلاف ورزی جس

کسی مسلمان حکمران نے کی، اس کی زندگی پر ایک بدنما داغ ہے،

جہانگیر اپنی ان معصیتوں کے باوجود مذہب کا برابر احترام کرتا رہا، پہلے ذکر آچکا ہے کہ اس نے ابوالفضل کا قتل اس لیے کرایا کہ اس کا خیال تھا کہ اسی نے اس کے باپ کو مذہبی گمرہی میں مبتلا کیا، اس کا بھی ذکر پہلے آیا ہے کہ اس نے لاہور کے شیخ ابراہیم کو مذہبی بے راہ روی اور سفلہ پروری کی وجہ سے چنار میں قید کردیا، اور پھر قاضی نور اللہ شوستری جیسے مقتدر شیعی عالم کو غصہ میں اس لیے قتل کرادیا کہ ان کی بعض باتوں سے اس کے مذہبی احساسات کو ٹھیس لگی، ان کی موت شیعوں کے لیے ایک بڑا المناک حادثہ ہے جس کا دکھ ان کو اب تک ہے، اسی لیے وہ شہید ثالث کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں، ملا عبد القادر جیسے متشدد سنی عالم بھی قاضی نور اللہ شوستری کے لیے بہت اچھے الفاظ استعمال کرتے ہیں، حالانکہ ملا صاحب نے اکبر اور اس کے دین الٰہی کے حامیوں کے لیے جو الفاظ استعمال کیے ہیں، ان سے ان پر غیر معمولی تعصب اور تنگ نظری کا الزام آتا ہے، لیکن وہ قاضی نور اللہ شوستری کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ شیعی مذہب است، اما بسیار صفت وعدالت ونیک نفسی وحیا وتقوی وعفاف و اوصاف اشراف موصوف است، وبعلم وحلم وجودت فہم وحدت طبع وصفائی قریحہ و ذکا مشہور است، صاحب تصانیف لائقہ است"

لیکن ان خوبیوں کے باوجود قاضی نور اللہ شوستری کی زبان سے جہانگیر کے سامنے عاجلانہ طور سے کچھ ایسے کلمات نکل گئے جن سے جہانگیر کو بڑا اشتعال پیدا ہوا، اور اس نے ان کو قتل کرادیا، یہ واقعہ ۱۰۱۹ھ یعنی اس کے پانچویں سال جلوس کا ہے، نور جہاں ایک سال کے بعد محل میں داخل ہوئی تھی، اس کی موجودگی میں شاید یہ حادثہ پیش نہ آتا، جہانگیر غالباً اپنی ندامت میں اس حادثہ کا ذکر اپنی تزک میں نہیں کرتا ہے لیکن ایسے مقتدر شیعہ عالم کا قتل جہانگیر کے تمام شیعی امرا کے لیے بہت ہی تکلیف دہ رہا،

اس حادثہ کے نو سال کے بعد جہانگیر کا تصادم حضرت مجدد الف ثانیؒ سے ہوا، اور اس کا آغاز

اس طرح ہوا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے ایک خواب کا ذکر اپنے مرشد حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے ایک مکتوب میں کیا جس میں تحریر فرمایا:۔

"....... دوسری عرض یہ ہے کہ دوسری دفعہ اس مقام کے ملاحظہ کے وقت اور بہت سے مقامات ایک دوسرے کے اوپر ظاہر ہوئے، نیاز و عاجزی سے توجہ کرنے کے بعد جب اس مقام سے اوپر کے مقام میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت ذی النورین رضی اللہ عنہ کا مقام ہے اور دوسرے خلفاء کا بھی اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے، اور یہ مقام بھی تکمیل و ارشاد کا مقام ہے، اور ایسے ہی اس مقام سے اوپر کے دو مقام بھی جن کا اب ذکر ہوتا ہے تکمیل و ارشاد کے مقام ہیں، اور اس مقام کے اوپر ایک اور مقام نظر آیا، جب اس مقام میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا مقام ہے اور دوسرے خلفاء کا بھی وہاں عبور واقع ہوا ہے، اور اس مقام سے اوپر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مقام ظاہر ہوا، بندہ اس مقام پر بھی پہنچا، اور اپنے مشائخ میں سے حضرت خواجہ نقش بند قدس سرہ کو ہر مقام میں اپنے ساتھ ہمراہ پاتا تھا، اور دوسرے خلفاء کا بھی اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے، سوائے عبور اور مقام اور مرور و ثبات کے کچھ فرق نہیں ہے، اور اس مقام کے اوپر سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور کوئی مقام معلوم نہیں ہوتا، اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مقام کے مقابل ایک اور نہایت عمدہ نورانی مقام کہ اس جیسا کبھی نظر میں نہ آیا تھا، ظاہر ہوا اور وہ مقام اس مقام سے تھوڑا بلند تھا جس طرح کہ صفہ کو سطح زمین سے ذرا بلند بناتے ہیں، اور معلوم ہوا کہ وہ مقام محبوبیت کا مقام ہے، اور وہ مقام رنگین اور منقش تھا، اپنے آپ کو بھی اس مقام کے عکس سے رنگین پایا" (ماخوذ از مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی اردو ترجمہ از قاضی عالم الدین صاحب)

اس خط کی شہرت پھیلی تو کچھ بدباطن اشخاص نے ان پر الزام رکھا کہ انھوں نے اپنے کو حضرت ابوبکرؓ سے افضل تر قرار دیا ہے، لیکن وہ اس الزام کی تردید اپنے ایک مکتوب میں یہ لکھ کر کرتے ہیں :-

وہ شخص جو اپنے آپ کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل جانے اس کا امر دو حال سے خالی نہیں ہے، یا وہ زندیق محض ہے یا جاہل...... یا وہ شخص جو حضرت امیر رضی اللہ عنہ کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل کہے، اہل سنت وجماعت کے گروہ سے نکل جاتا ہے تو پھر اس شخص کا کیا حال ہے جو اپنے آپ کو افضل جانے۔"

جہانگیر کو بھی حضرت مجددؒ کے اس خط کی خبر ملی، اس کو اس کا یہ مطلب سمجھایا گیا کہ حضرت احمد سرہندیؒ اس کے دعویدار ہیں کہ وہ مقام محبوبیت میں پہنچکر خلفاء راشدین سے زیادہ مقرب الٰہی ہو گئے ہیں،

تذکرہ نگاروں اور مقالہ نویسوں کی روایت ہے کہ دربار میں حضرت مجدد والف ثانیؒ طلب کیے گئے، جہانگیر نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے کو حضرت ابوبکر صدیقؓ سے زیادہ افضل سمجھتے ہیں، انھوں نے جواب دیا کہ میں حضرت علیؓ کو تو ان پر فضیلت دینے کے لیے تیار نہیں ہوں، اپنے کو ان سے افضل تر سمجھنے کا کیا سوال ہو سکتا ہے، میں تو اپنے کو کتے سے بھی افضل نہیں تصور کرتا ہوں، پھر ان سے پوچھا گیا کہ تقرب الٰہی میں اپنے کو حضرت عثمانؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مقام سے گزرتا ہوا کیوں لکھا ہے، جواب دیا کہ دربار کا کوئی امیر بڑے منصب داروں کے مقام سے گذرتا ہوا تخت شاہی سے تقرب حاصل کرتا ہے تو کیا وہ ان منصب داروں سے معزز اور افضل تر سمجھا جاتا ہے، جہانگیر خرسند ہوا، لیکن فوراً ہی اس نے سجدۂ تعظیمی نہ کرنے کی بازپرس کی، حضرت مجددؒ نے فرمایا کہ سجدہ بجز خداوند قدوس کے کسی اور کے لیے جائز نہیں، دربار کے شیخ اسلام مفتی عبدالرحمن نے سلاطین کے لیے سجدۂ تحیت کا جواز پیش کیا، لیکن حضرت مجددؒ نے فرمایا کہ یہ رخصت ہے اور عزیمت کے خلاف ہے، عزیمت یہی ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ نہ کیا جائے، اس خلاف توقع جواب کو سن کر جہانگیر نے مشتعل ہو کر ان کو گوالیار میں محبوس کر دیا،

گر کہا جاتا ہے کہ ایک روز اس نے خواب میں دیکھا کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس سے فرما رہے ہیں کہ تم نے ایک بڑے آدمی کو قید کر دیا ہے، جہانگیر نے منفعل ہو کر ان کی رہائی کا حکم صادر کیا اور اپنے پاس بلا کر معذرت کی، اور پھر ان کی ذات اقدس سے اس کی عقیدت اتنی بڑھی کہ روزانہ مغرب کے بعد وہ ان سے ملاقات کرتا، اور ان کے سرچشمۂ علم و فضل سے اس کے قلب کی تطہیر ہوتی گئی،

لیکن اس سلسلہ میں خود جہانگیر کا بیان جو تزک جہانگیری میں ہے، وہ ایک عقدۂ لاینحل کی حیثیت رکھتا ہے، وہ اپنے چودھویں سال جلوس میں لکھتا ہے:-

"ان ہی دنوں مجھ سے عرض کیا گیا کہ شیخ احمد نامی نے ایک جعل ساز (شیادے) نے سرہند میں مکر و فریب (زرق وسالوس) کا جال بچھا کر بہت سے ظاہر پرستوں کو پھانس رکھا ہے اس نے ہر شہر اور ہر علاقہ میں ایک خلیفہ مقرر کر رکھا ہے جو دوکانداری معرفت فروشی اور مردم فریبی میں بہت پختہ ہیں، اس نے اپنے مریدوں اور معتقدوں کو بہت سے خرافات لکھے ہیں، ان کو ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے، اور نام مکتوبات رکھا ہے، اس میں بہت سی مہمل اور لاطائل باتیں لکھی ہیں، جو کفر کی حد تک پہنچتی ہیں، ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ میں سلوک کی راہ میں ذی النورین کے مقام سے گذرا، جو نہایت اونچا اور پاکیزہ تھا، اور اس سے گذر کر مقام فاروق سے پیوستہ ہو گیا، اور مقام فاروق سے گذر کر مقام صدیق عبور کیا، ہر مقام کی تعریف اس کے مطابق کر کے لکھا ہے کہ مقام محبوبیت میں پہنچ گیا، یہ مقام مشاہدہ تھا، جو کہ نہایت منور اور دلکش تھا، اور مجھ پر مختلف قسم کے انوار کا عکس پڑ رہا تھا، یعنی استغفر اللہ خلفاء کے مقام سے گذر کر ان سے عالی تر مقام پر پہنچ گیا، اس نے اسی طرح کی اور بھی گستاخانہ باتیں لکھی ہیں، جن کا لکھنا طوالت اور بے ادبی ہے، میں نے

اسی بنا پر حکم دیا کہ وہ دربار میں حاضر ہو، میرے حکم کے مطابق آیا اور جو کچھ میں نے پوچھا اس کا معقول جواب نہیں دے سکا، وہ ریاکار، بے عقل، مغرور، خود پسند معلوم ہوا، اس کے اس حال کی اصلاح کے لیے یہی مناسب سمجھا کہ کچھ روز کے لیے اس کو قید کر دیا جائے، تاکہ اس کے مزاج کی شوریدگی، دماغ کی آشفتگی کچھ دور ہو جائے، اور عوام کی شورش فرو ہو جائے، اس کو انی رائے سنگھ دلن کے حوالے کیا کہ اس کو گوالیار کے قلعہ میں قید رکھے۔''

اس تحریر سے یہ ظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جہانگیر اپنے چودھویں سال جلوس تک حضرت مجددؒ سے بالکل ناواقف تھا، اور اس سال ان سے جعل ساز، معرفت فروش اور مردم فریب کی حیثیت سے پہلی دفعہ واقف ہوا، اور جب ان سے ملا تو ان کو شوریدہ مزاج، آشفتہ دماغ، بے عقل، مغرور اور خود پسند پایا، تزک جہانگیری اپنی صداقت پسندی، صاف گوئی اور حقیقت نگاری کے لیے مشہور ہے، لیکن مذکورۂ بالا بیان میں یہ چیزیں بالکل نظر نہیں آتی ہیں، یہ کسی طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا ہے کہ جہانگیر حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اہمیت سے چودھویں سال جلوس تک بالکل بے خبر رہا، پہلے کہا جا چکا ہے کہ عہد اکبری میں جو غیر اسلامی اور منکرانہ رنگ پیدا ہو گیا تھا، اس کو دور کرنے کے لیے انھوں نے پوری کوشش کی، اور شیخ فرید بخاری، خواجہ جہاں، خان خانان عبدالرحیم خان اور دوسرے جلیل القدر امراء کو برابر خطوط لکھ کر جہانگیر کو اپنی حکومت میں اسلامی رنگ پیدا کرنے پر بالواسطہ مجبور کیا، اور جہانگیر نے حکم بھی دیا کہ چار دیندار عالم منتخب کیے جائیں اور ان کے مشورے سے ملکی نظم و نسق ایسا قائم کیا جائے کہ کوئی حکم خلاف شرع نہ ہونے پائے، یہ سن کر حضرت مجددؒ نے شیخ فرید بخاری کو ایک مکتوب میں لکھ کر چار کے بجائے صرف ایک عالم کو منتخب کرنے کی تجویز پیش کی تاکہ اختلاف پیدا نہ ہو، شیخ فرید بخاری جہانگیر کا بہت ہی محبوب مقرب بارگاہ تھا، اس کو جہانگیر اپنا بہت بڑا مخلص اور فدائی بھی سمجھتا رہا، کیونکہ اس کی تخت نشینی میں شیخ فرید کا

بڑا ہاتھ رہا، اس نے اس کو مرتضیٰ خاں کا خطاب بھی دیا، اسی کے ساتھ شیخ فرید حضرت مجددؒ کا بڑا معتقد بلکہ عزیز مرید بھی تھا، اس کا انتقال جہانگیر کے گیارہویں سال جلوس میں ہوا، ظاہر ہے کہ اس کی وساطت سے جہانگیر کو حضرت مجددؒ کی اہمیت کا اندازہ ضرور ہوا ہوگا، اور وہ زندہ رہتا تو جہانگیر اور حضرت مجددؒ کے اختلاف کی نوبت ہی نہیں آتی، پھر خود شہزادہ خرم اور دوسرے امراء کو حضرت مجددؒ سے جو محبت اور عقیدت رہی، اس سے جہانگیر بے خبر نہ رہا ہوگا، ایک روایت یہ بھی ہے کہ جہانگیر اور حضرت مجددؒ میں مراسلت بھی رہی، لیکن تعجب ہے کہ دونوں میں ملاقات نہیں ہوئی، حالانکہ جہانگیر اپنے دور کے تمام اکابر بزرگان دین سے مل کر اپنے اسلامی حسن باطن'' کا ثبوت دیتا رہا، وہ اپنے بارہویں سال جلوس میں احمد آباد گیا تو وہاں کے مشہور بزرگ شیخ اسمٰعیل بن شیخ محمد غوثؒ سے ملا، اور ان کو خلعت اور پانچ سو روپے دیے، اور پھر جتنے بزرگ اس سے ملنے کے لیے آئے ان کو بھی خلعت اور جاگیریں عطا کیں اور اپنے کتب خانۂ خاص سے تفسیر کشاف، تفسیر حسینی اور روضۃ الاحباب وغیرہ جیسی کتابیں نذر کیں، اور پھر اس نے ایک عام حکم دیا کہ مشائخ کی اولادوں کے ساتھ ہر قسم کی رعایتیں کی جائیں، چودھویں سال جلوس میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے ملا تو انکے متعلق لکھا ہے کہ دہلی کے گوشہ میں بیٹھ کر مدت سے توکل و تجرید کی زندگی بسر کر رہے ہیں، انکی صحبت بے ذوق نہیں ہے، طرح طرح کے مراحم و دلنوازی کر کے ان کو رخصت کیا، اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں مشائخ ہند کے حالات ہیں، اس کے لکھنے میں بڑی زحمت اٹھائی ہے، وہ اسی سال پنجاب گیا تو کلانور کے پاس پہنچکر اس کو سندھ کے مشہور بزرگ شیخ میر محمد مشہور بہ میاں میرؒ سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا جو اس وقت لاہور میں تھے، اس کا لاہور جانا ممکن نہ تھا، اسلیے حضرت میاں میرؒ خود اس کے پاس تشریف لائے، جہانگیر ان سے مل کر متاثر ہوا، ان کے بارہ میں لکھتا ہے کہ بڑے قابل، مرتاض، مبارک نفس، صاحب حال، گوشہ نشین، توکل پسند اور دنیا سے مستغنی بزرگ ہیں، خلوت میں ان کی صحبت سے مستفید ہوا، اس زمانہ

میں ان کا وجود غنیمت اور عزیز ہے، ان سے بڑے حقائق و معارف سننے میں آئے، میں نے چاہا کہ آپ
کی خدمت میں نذر پیش کروں لیکن جرأت نہ ہوئی، آخر میں ایک سفید ہرن کی کھال جانماز کے طور پر
استعمال کرنے کے لیے ان کی خدمت میں پیش کی،

بزرگان دین کی اس عقیدت کے باوجود حضرت مجددؒ کے تمام کارناموں اور خوبیوں کو نظر انداز
کرکے جہانگیر کا ان کو جعل ساز، دوکاندار، معرفت فروش، مردم فریب وغیرہ کہنا تعجب انگیز ہے، کیونکہ
وہ طبعاً بہت ہی محبت کیش تھا، اور اس کا دل بڑا ہی دردمند واقع ہوا تھا، خود حضرت مجددؒ اس کے
اسلامی حسن باطن کے معترف رہے، اس لیے اس نے حضرت مجددؒ کی شان میں جو الفاظ لکھے ہیں ان کو
پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، وہ علم وفن کا بڑا داناشناس بھی تھا، اس لیے حضرت مجددؒ کے مکتوبات جیسے گنجینۂ حقائق
و معارف کو مہمل اور لاطائل کہنا اور بھی زیادہ بوالعجبی ہے، یا تو اس پوری عبارت کو الحاقی سمجھ کر
رد کر دیا جائے، اور اگر یہ الحاقی نہیں ہے، تو پھر یہ قیاس کرنا غلط نہ ہوگا کہ جہانگیر نے حضرت مجددؒ کی
شان میں اس قسم کے نازیبا الفاظ لکھ کر نورجہاں اور اپنے شیعی امراء کی نظروں میں قاضی نوراللہ شوستری
کے خون کا دھبہ اپنے دامن سے دھونے کی کوشش کی ہے، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت
مجددؒ کی بزرگی اور شہرت کے باوجود جہانگیر نے ان سے اسیری کے واقعہ سے پہلے ملنا پسند نہیں کیا،
اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حضرت مجددؒ نے اپنی تجدیدی اور اصلاحی کوششوں میں شیعوں کے
خلاف بھی ایک محاذ قائم کیا تھا، اور ان کے اثرات کو دور کرنے کی خاطر بڑے شد و مد سے انکے
مذہبی عقائد کی تردید میں لگے ہوئے تھے، ظاہر ہے کہ وہ تمام شیعی امراء کی نظروں میں خار کی طرح
کھٹک رہے ہوں گے، ایسی صورت میں جہانگیر نے اپنے شیعی امراء کی دلداری اور دلجوئی کی خاطر
ان سے ملنا پسند نہ کیا ہو، اس لیے اگر یہ کہا جاتا ہے کہ شیعی امراء نے جہانگیر کو ان کے خلاف ابھار کر
ان کو قید کرا دیا تو یہ بعید از قیاس نہیں، اس سے نہ صرف قاضی نوراللہ شوستری کے قتل کا خونبہا ادا

ہوگیا، بلکہ شیعیت کے خلاف بھی کچھ دنوں کے لیے سرگرمیاں کم ہوگئیں، اگر قاضی نوراللہ شوستری کے
قتل سے جہانگیر کے سنی امراء خوش ہوئے ہوں گے تو اس کے شیعی امراء کو حضرت مجددؒ کی اسیری سے کچھ
تسکین ضرور ہوئی ہوگی، جہانگیر کا حضرت مجددؒ کو اپنے ایک ہندو منصب دار رائے سنگھ کے حوالے کرنا
بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اس معاملہ میں وہ اپنے سنی امراء پر زیادہ بھروسہ نہیں رکھتا تھا، کیونکہ اس کو
سنی امراء میں ان کی مقبولیت کا اندازہ رہا ہوگا،

اس اسیری کے بعد تذکرہ نگار تو یہ لکھتے ہیں کہ جہانگیر نے اپنی غلطی پر منفعل ہو کر حضرت مجددؒ کو رہا کر دیا،
اور ان سے معذرت کی، لیکن وہ خود اپنے پندرھویں سال جلوس میں لکھتا ہے کہ

"شیخ احمد سرہندی دکان آرائی، خود فروشی اور بے صرفہ گوئی کی خاطر کچھ دنوں کے لیے زندان
ادب میں محبوس تھے، ان کو اپنے پاس بلا کر رہائی دی، خلعت اور خرچ کے لیے ایک ہزار روپے
بھی دیے، اور ان کو اختیار دیا کہ وہ جاہے چلے جائیں یا میرے ساتھ رہیں، انھوں نے انصاف
کے ساتھ عرض کیا کہ اس تنبیہ اور تادیب سے ان کو ہدایت حاصل ہوئی، انھوں نے ساتھ
رہنے ہی میں اپنی مراد برآری دیکھی؛

اگر یہ عبارت بھی الحاقی نہیں تو جہانگیر کے اس بیان میں بھی شیعی اعزہ اور امراء کی دلدہی کے جذبہ
کا اظہار ہوتا ہے، اس ناخوشگوار واقعہ کا انجام خوشگوار طریقہ پر ہوا، رہائی کے بعد جہانگیر اور حضرت مجددؒ
دونوں ایک دوسرے سے قریب تر ہوگئے، حضرت مجددؒ اپنے صاحبزادوں خواجہ محمد سعید اور خواجہ
محمد معصوم کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ "الحمد للہ...... بادشاہ کے ساتھ عجیب و غریب صحبتیں
گزر رہی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان گفتگوؤں میں بال برابر مداہنت نہیں دخل پاتی، اللہ تعالیٰ
کی توفیق سے ان محفلوں میں وہی باتیں ہوتی ہیں جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہوا کرتی ہیں،
اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو دفتر ہو جائے، خاص کر آج ماہ رمضان کی سترہویں رات کو انبیاء

علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت اور عقل کے عدم استقلال اور آخرت کے ایمان اور اس کے عذاب و ثواب اور رویت و دیدار کے اثبات اور حضرت خاتم الرسلؐ کی نبوت کی خاتمیت اور ہر صدی کے مجددؒ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی اقتدا، اور تراویح کے سنت اور تناسخ کے باطل ہونے اور دوسرے موضوع پر بہت کچھ مذکور ہوا، اور بادشاہ بڑی خوشی سے سنتے اور سب کچھ قبول کرتے رہے"۔

اس خط سے ظاہر ہے کہ دونوں کے تعلقات خوشگوار ہو گئے تھے، لیکن بعض تذکرہ نویس اور مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ جہانگیر نے حضرت مجددؒ کو رہا کرنے کے بعد اپنے ساتھ رکھ کر نظر بند کر رکھا تھا، لیکن یہ محض بدگمانی اور غلط قسم کی قیاس آرائی ہے، ایک مشہور روایت یہ بھی ہے کہ جہانگیر آخر میں حضرت مجددؒ سے اتنا متاثر ہو گیا تھا کہ وہ کہا کرتا تھا کہ میرے پاس ایک دستاویز نجات ہے، اور وہ حضرت شیخ کا ارشاد مبارک ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم کو جنت میں لے جائے گا تو ہم تیرے بغیر نہ جائیں گے، کچھ اہل قلم اس روایت کو مستند نہیں سمجھتے اور اس کی تردید میں اپنا زور قلم خواہ مخواہ صرف کرتے ہیں، لیکن اس کو صحیح مان لیا جائے تو کیا ہرج ہے، دوسری قومیں طرح طرح کی روایتیں گڑھ کر اپنی تاریخ بنا رہی ہیں، اگر ہماری تاریخ میں کچھ ایسی روایتیں ملتی ہیں جن کی صحت اور عدم صحت دونوں مصدقہ نہیں، لیکن اگر ان سے تاریخ کا کوئی پہلو روشن ہوتا ہے تو ہمارے اہل قلم کو بلا وجہ اس کی تردید کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے، اس سے نہ صرف ہماری تاریخ کو نقصان پہنچا ہے، بلکہ ایک دوسرے کی تردید اور تائید کرنے میں خواہ مخواہ علمی اور تحقیقی سرگرمیاں برباد ہوتی رہی ہیں،

حضرت سرمد کی شہادت عالمگیری عہد کا ایک بہت بڑا المیہ حضرت سعید ائے سرمد کی شہادت ہے، وہ نسلاً کاشانی یہودی تھے، اسلام لانے سے پہلے ان کا شمار علمائے یہود میں تھا، وہ توریت کے بہت بڑے عالم سمجھے جاتے تھے، اسلام قبول کرنے کے بعد فلسفہ و حکمت میں بڑی دستگاہ بہم پہنچائی، جس کا اظہار انھوں نے اپنی رباعیوں میں جا بجا کیا ہے، وہ ایک ممتاز رباعی گو کی حیثیت سے

بھی مشہور ہوئے، تجارت ان کا خاندانی پیشہ تھا، اسی سلسلہ سے اپنے وطن کاشان کو چھوڑا تو خلیج فارس کے راستے سے ہوتے ہوئے ٹھٹھہ آئے، یہاں ان کو ابھے چند نامی ایک ہندو لڑکے سے محبت ہو گئی، لڑکے نے بھی ان کی مریدی اختیار کر کے ان سے عبرانی، توریت اور زبور پڑھنا شروع کیا، اور ان کی نگرانی میں توریت کے ابتدائی چھ ابواب کے ترجمے فارسی میں کیے، جن کو دبستان المذاہب کے مصنف نے اپنی کتاب میں شامل کر لیا ہے، ٹھٹھہ کے قیام میں حضرت سرمد اس قدر مغلوب الحال ہو گئے تھے کہ بیخودی کے عالم میں کوچہ اور بازار میں برہنہ دکھائی دیتے تھے، اسی مجذوبانہ کیفیت میں وہ حیدرآباد دکن پہنچے، اور وہاں سے شاہجہاں کے عہد میں دہلی آئے، ان کی عارفانہ رباعیوں کی شہرت دہلی پہلے پہنچ چکی تھی، اس لیے ان کے پاس ان کا کلام سننے کے لیے لوگوں کا بڑا مجمع رہنے لگا، داراشکوہ بھی ان کا گرویدہ ہو گیا، اور انھوں نے پیشین گوئی کی کہ شاہجہاں کے بعد وہی بادشاہ ہوگا، اس سے داراشکوہ کی گرویدگی اور بڑھ گئی، وہ داراشکوہ کے سامنے آتے تو اپنی عریانی چھپانے کے لیے کمر میں کپڑے کا کوئی ٹکڑا باندھ لیتے، لیکن جب اورنگ زیب اور دارا کے درمیان جانشینی کی جنگ ہوئی تو دارا کو شکست ہوئی اور پھر وہ ارتداد، الحاد، اور کفر کے الزام میں تہ تیغ ہوا، تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ عالمگیر نے تخت نشینی کے بعد سرمد سے دریافت کیا کہ انھوں نے داراشکوہ کو بادشاہت کی جو خوشخبری دی تھی وہ کیسے پوری نہ ہو سکی؟ سرمد نے جواب دیا کہ وہ مژدہ صحیح نکلا، کیونکہ دارا کو ابدی سلطنت کی تاجپوشی نصیب ہوئی ہے، یہ جواب اورنگ زیب کو ناگوار گزرا، بعض تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ ان کی رباعیوں میں حسب ذیل رباعی کی شہرت ہوئی

آنکو کہ سر حقیقتش باور شد   خود پہن تر از سپہر پہناور شد
ملا گوید کہ بر شد احمد بہ فلک   سرمد گوید فلک باحمد در شد

تو ان پر یہ الزام رکھا گیا کہ وہ معراج جسمانی کے منکر ہیں، تذکرہ نویس یہ بھی لکھتے ہیں کہ قاضی

عبد القوی فقہی جزئیات کا بڑا لحاظ رکھتے تھے، احتساب میں بھی بہت سخت تھے، ان کو حضرت سرمد کی برہنگی بڑی ناگوار تھی، اس لیے ان سے باز پرس کی تو انھوں نے جواب دیا کہ "شیطان قوی است"

اور پھر یہ رباعی پڑھی:

خوش بالائے کردہ چنیں پست مرا | چشمے بدو جام بردہ از دست مرا
او در بغل من است و من در طلبش | دزدے عجبے برہنہ کردہ است مرا

قاضی عبد القوی مذکورہ بالا جواب اپنے اوپر طنز سمجھے اور انھوں نے ان پر عریانی کا جرم قائم کرکے عالمگیر کو ان کے قتل کا مشورہ دیا، لیکن عالمگیر نے کہا کہ صرف عریانی وجہ قتل نہیں ہو سکتی ہے، بعض تذکروں میں یہ بھی ہے کہ عالمگیر نے ان کو دربار میں بلا کر ان سے برہنگی کا سبب پوچھا تو انھوں نے یہ رباعی پڑھی:

آنکس کہ ترا سریر سلطانی داد | ما را ہمہ اسباب پریشانی داد
پوشاند لباس ہر کرا عیبے دید | بے عیباں را لباس عریانی داد

ان کے متعلق یہ بھی مشہور تھا کہ وہ کلمہ کا صرف ایک جز یعنی لا الٰہ پڑھتے ہیں،

اس طرح حضرت سرمد پر مختلف قسم کے الزامات تھے، علماء ان سے خوش نہ تھے، اور خود عالمگیر کو بھی ان سے ناگواری تھی، اس لیے وہ علماء کے ایک اجتماع میں طلب کیے گئے، دربار میں ان سے کلمہ پڑھنے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے حسب عادت صرف ایک جز یعنی لا الٰہ پڑھا، علماء نے اس پر اعتراض کیا تو انھوں نے کہا کہ میں ابھی نفی میں مستغرق ہوں، مرتبۂ اثبات پر نہیں پہنچا ہوں، تو پھر جھوٹ کیسے کہوں، علماء نے کہا ایسا کہنا کفر ہے، اگر کہنے والا توبہ نہ کرے تو واجب القتل ہے، اور ان کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا گیا، تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ اس فتویٰ کے بعد دربار سے حضرت سرمد قتل گاہ کی طرف چلے تو تمام شہر امنڈ پڑا، اس قدر ہجوم تھا کہ

راستہ چلنا دشوار ہو گیا لیکن حضرت سرمد پر کوئی اثر نہ تھا، اور وہ اطمینان و سکون کے ساتھ رباعیاں کہتے جا رہے تھے، اور جب جلاد تلوار لیکر ان کی طرف بڑھا تو ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی، اور وہ یہ شعر پڑھ رہے تھے:

رسیدہ یار عریاں تیغ ایں دم | بہر رنگے کہ آئی می شناسم

پھر یہ اشعار پڑھے:

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم | دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم
سر جدا کرد از تنم شوخے کہ با ما یار بود | قصہ کوتہ کرد ورنہ درد سر بسیار بود

تذکرہ نویس یہ بھی لکھتے ہیں سر کشتہ سے دیر تک کلمۂ طیبہ کی آواز بلند ہوتی رہی، واللہ اعلم، اور ان کی ذات سے لوگوں کی گرویدگی آج تک باقی ہے، اور انھوں نے وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود جبر و اختیار، محبت الٰہی، ذکر الٰہی، رضائے الٰہی، دیدار الٰہی، دیدار نبوی پر جو رباعیاں کہی ہیں وہ آج بھی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں لیکن ان کی عارفانہ انفرادیت ان کی مجذوبانہ کیفیت میں کچھ ایسی گم ہو کر رہ گئی ہے کہ ان کے متعلق جب کوئی کچھ لکھنے بیٹھتا ہے تو طرح طرح کی موشگافیاں کرتا ہے، چنانچہ کلیفورنیا یونیورسٹی کے پروفیسر والٹر جے فشل نے حیدر آباد دکن کے رسالہ اسلامک کلچر میں "ازمنۂ وسطی میں ہندوستان کے مغل شاہنشاہوں کے دربار میں یہود اور یہودیت" کے عنوان سے ایک مضمون میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرمد بظاہر مسلمان ہو گئے تھے، لیکن انھوں نے اسلام برائے نام قبول کیا تھا، وہ ہمیشہ یہودیوں کو تنبیہ کرتے رہتے تھے کہ وہ مسلمانوں کے مذہب کو قبول نہ کریں، اور انھوں نے ہندوستان پہنچ کر یہودیت کی بڑی خدمت کی، اس لیے وہ یہودی مذہب کی تاریخ میں نمایاں جگہ پانے کا حق رکھتے ہیں، ان کی پہلی خدمت تو یہ تھی کہ انھوں نے دبستان المذاہب جیسی اہم کتاب کے مصنف سے علمی اشتراک کرکے یہودیت کو فارسی جاننے والے

ہندوستانیوں سے روشناس کیا، ان کی دوسری خدمت یہ تھی کہ ان ہی کی وساطت سے ہندوستان میں توریت کا فارسی ترجمہ رائج ہوا، تیسری بڑی خدمت یہ تھی کہ انھوں نے داراشکوہ کو یہودی عقائد سے واقف کرایا، پروفیسر مذکور آخر میں یہ لکھتے ہیں کہ سرمد کے قتل کرانے کی ایک بڑی وجہ ان کی یہودیت بھی تھی، انھوں نے اسلام ضرور قبول کرلیا تھا، لیکن وہ اسلام سے سطحی طور پر متاثر تھے، وہ صوفی بن کر شاہی خاندان کو اپنے زیر اثر لارہے تھے، اورنگ زیب نے اس خطرہ کو محسوس کرلیا تھا، چنانچہ دارا کے قتل کے محضر میں اس نے یہ وضاحت بھی کردی تھی کہ داراشکوہ کے ذریعہ یہودیت اور کفر کا غلبہ ہوجاتا،

پروفیسر مذکور یہودی ہیں اس لیے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں خود ان کی یہودیت کی فتنہ سامانی اور شر انگیزی ہے، حضرت سرمد سے عام مسلمانوں کو جو عقیدت پیدا ہوگئی ہے، اس کو وہ کسی طرح زائل کرنا چاہتے ہیں، علماء اور عالمگیر نے جو کچھ ان کے ساتھ کیا، وہ صحیح تھا یا غلط، اس بحث سے قطع نظر ہوکر یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج بھی ان کے مرقد پر زائرین کا مجمع رہتا ہے، جو ان کی مقبولیت کی دلیل ہے اور موجودہ دور کا بڑے سے بڑا متقشف عالم بھی ان کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال نہیں کرتا،

صوفیہ کرام کی شان استغناء

اوپر کی تفصیلات سے ظاہر ہوا ہوگا کہ بعض سلاطین کو کچھ صوفیہ سے ذاتی یا سیاسی یا مذہبی اختلافات ضرور ہوئے، لیکن ان کی مثالیں زیادہ نہیں ہیں، زیادہ تر سلاطین اکابر صوفیہ کی بارگاہوں میں سر نیاز خم کرتے رہے، لیکن ان روحانی بزرگوں نے ان سے قریب ہونے کے باوجود ان سے دور رہ کر اپنی روحانی عظمت برقرار رکھی، اور اپنی فقیری کی شان ان سے مستغنی اور بے نیاز رہنے ہی میں تصور کی، اور ان سے کسی قسم کا مادی فائدہ اٹھانا اپنے لیے سم قاتل سمجھتے رہے،

سلطان التمش حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کا مرید تھا، اس کو حضرت خواجہ کے گھر والوں کی عسرت اور تنگی کا حال معلوم ہوا تو اس نے اپنے وزیر کے معرفت کچھ گاؤں کا فرمان لکھکر ان کی خدمت میں بھیجا، خواجہ صاحب نے لینے سے انکار کیا اور فرمایا کہ ہمارے خواجگان نے کسی سے گاؤں قبول کیا ہوتا تو ہم بھی قبول کرلیتے، اگر ہم

گاؤں لے لیں تو قیامت کے روز اپنے خواجگان کو کیا منہ دکھائیں گے، سلطان ناصر الدین محمود نے حضرت بابا گنج شکرؒ کی خدمت میں اپنے وزیر الغ خاں کو چار گاؤں کا فرمان اور ایک کثیر رقم بطور ہدیہ دے کر بھیجا، مگر انھوں نے یہ کہکر واپس کردیا کہ ان کو دوسروں کو ضرورت ہو، اسی طرح ایک بار ان کی خدمت میں اجودھن کے والی نے کچھ گاؤں اور نقد رقم پیش کرنے کی کوشش کی تو فرمایا کہ اگر میں یہ گاؤں اور رقم لے لوں تو مجھے لوگ درویش نہیں کہیں گے مالدار کہیں گے، اور میرا لقب درویش دیہہ دار ہوجائیگا،

اگر اصرار کرکے سلاطین اور امراء کچھ نذرانے ان اکابر صوفیہ کو پیش کرتے تو وہ ایک ہاتھ سے لیکر دوسرے ہاتھ سے مساکین اور غرباء میں تقسیم کردیتے، سلطان محمد تغلق نے حضرت شیخ قطب الدین منورؒ کے پاس شہزادہ فیروز اور مولانا ضیاء الدین برنی کو ایک لاکھ ٹنکے دے کر بھیجا، انھوں نے اتنی بڑی رقم دیکھکر فرمایا یہ درویش ایک لاکھ ٹنکے لیکر کیا کریگا اور لینے سے انکار کردیا، شہزادہ فیروز اور مولانا ضیاء الدین برنی سلطان کے پاس واپس گئے، سلطان نے پچاس ہزار ٹنکے دے کر پھر دونوں کو بھیجا لیکن شیخ نے ان کو بھی قبول نہیں کیا، بالآخر دو ہزار ٹنکے بھیجے گئے لیکن ان کو بھی قبول نہیں کیا، اور فرمایا درویش کے لیے دو سیر کھچڑی اور ایک سیر روغن کافی ہے، لیکن جب اصرار کیا گیا تو انھوں نے دو ہزار کی رقم لے لی، کچھ تو اپنے مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار کے لیے محفوظ رکھی اور بقیہ فقراء میں تقسیم کردی،

اسی طرح سلطان محمد تغلق نے حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے اخراجات کے لیے ایک پرگنہ کی جاگیر کا فرمان جاری کیا، اور اپنے مقطع کو حکم دیا کہ اگر وہ قبول نہ کریں تو بھی زبردستی دیا جائے، شاہی مقطع کی گلوخلاصی کی خاطر انھوں نے یہ جاگیر قبول کرلی لیکن فیروز شاہ تغلق کے عہد میں دہلی جاکر یہ فرمان واپس کردیا کہ یہ ان کے کام کا نہیں، فیروز شاہ تغلق نے حصول برکت کی خاطر کچھ خدمت کرنی چاہی اور ایک بڑی رقم پیش کی، اس کو قبول تو فرمالیا لیکن شاہی دربار سے نکلتے ہی فقراء اور مساکین میں تقسیم کردیا اور درویشانہ استغنا کے ساتھ خالی ہاتھ وطن کی طرف مراجعت کی،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا مطبخ ہمیشہ گرم رہتا، کئی ہزار فقرا، اور مساکین ان کے مطبخ میں روزانہ کھانا کھاتے، ان اخراجات کے لیے ان کے یہاں بکثرت نذرانے آتے لیکن دن کو جو چیزیں خانقاہ میں آتیں، شام تک تقسیم کردیجاتیں، اگر خانقاہ میں دنیاوی ساز و سامان جمع ہوجاتے تو ان کو دیکھ کر ان پر گریہ طاری ہوجاتا، اور اگر کسی وقت کوئی قیمتی چیز بطور تحفہ آجاتی تو اور بھی زیادہ آہ و بکا کرتے اور ہدایت دیتے کہ یہ جلد از جلد فقرا میں تقسیم کردیجائے اور جب یہ محتاجوں کو پہنچ جاتی تو ان کو اطمینان ہوتا، وہ ہر جمعہ کو تجرید فرماتے، یعنی وہ اپنے تمام حجروں اور انبار خانوں کو یہاں تک خالی کرادیتے کہ ان میں جھاڑو دیدیجاتی، اس کے بعد جامع مسجد تشریف لے جاتے اور اطمینان سے نماز ادا کرتے، وہ بادشاہوں اور شہزادوں سے تحفے اور ہدیے قبول نہیں کرتے اور کوئی پیش کرتا تو ٹھنڈی آہ بھر کر کہتے کہ یہ لوگ درویشی کو غارت کرتے ہیں،

اکابر صوفیہ کی اولادوں کی روایت شکنی

آگے چل کر ان بزرگوں کی اولادوں اور سجادہ نشینوں میں یہ شان باقی نہیں رہی، سلاطین وقت نے ان کو عہدے دیے، تو ان کو قبول کرلیا، اور ان کی خانقاہوں کیلیے جاگیریں عطا کیں تو خوشی سے منظور کرلیں، بلکہ جاگیریں حاصل کرنے کی کوشش کی.

حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے صاحبزادے اور سجادہ نشین شیخ علاء الدین اجودھنیؒ شاہی دربار کی حاضری کو نجس اور پلید سمجھتے رہے، اسی لیے جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے، جب حضرت رکن الدین ملتانیؒ دہلی کے دربار سے واپسی میں اجودھن ان کی ملاقات کو آئے اور ان سے معانقہ کیا تو انھوں نے معانقہ کے بعد غسل کیا تاکہ دربار کی نجاست دور ہوجائے لیکن خود ان کے صاحبزادوں میں شیخ معز الدین اور شیخ علم الدین نے محمد تغلق کے عہد میں عہدے قبول کیے، اول الذکر گجرات کے ناظم ہوئے اور آخر الذکر شیخ الاسلام کے عہدے پر مامور کیے گئے،

حضرت شیخ عبد القدوسؒ کے پوتے ملا عبد النبی اکبر کے زمانہ میں صدر الصدور بننے کو تو بن گئے، لیکن آخر میں اکبر کو ان سے جو اختلاف ہوا تو ان کو قید خانہ میں بند کردیا، جہاں وہ عالم بقا کو سدھارے، ملا عبد القادر بدایونی کا بیان ہے کہ اکبر نے حضرت غوث گوالیاریؒ کو ایک کروڑ درہم کی جاگیر دی تھی،

اس لیے ان کے اخراجات بہت تھے اور وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ شاہانہ کر و فر کے ساتھ سفر کرتے تھے،

حضرت شیخ سلیم چشتیؒ نے راہ سلوک طے کرنے میں بڑی ریاضت کی، اور انتہائی فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی، لیکن ان کے معاصر شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کا بیان ہے کہ آخر میں ان میں بڑی تبدیلی پیدا ہوگئی تھی، انھوں نے عمارتیں بنوانی شروع کیں، باغ لگوائے اور کنوئیں کھدوائے، اور بعض عادتیں جو شریعت کے خلاف تھیں، عوام کی طرح ان میں بھی پیدا ہوگئیں، یہ تبدیلی شاہی دربار سے تعلقات کے بعد ہوئی، جہانگیر نے ان کی اولادوں کو بھی بڑے بڑے عہدے دینے شروع کیے، ان کے پوتے اسلام خاں فاروقی چشتی کو بنگال کا صوبہ دار مقرر کیا، عجیب و غریب صفات رکھتے تھے، میدان جنگ میں ہاتھی سے لڑجاتے تھے، اور اس کو زمین پر دے مارتے تھے، خاندانی روایت کے مطابق صوفی بھی تھے، زندگی بھر جوار کی روٹی، ساٹھی کا چاول اور ساگ کھاتے رہے، مذہبی احکام کے بھی بڑے پابند تھے لیکن امارت آئی، تو لوازم امارت کی خاطر فنون لطیفہ کی بھی سرپرستی کرنے لگے اور بنگال کے رقص و سرود کے ارباب کمال مثلاً لولی، ہورکنی، کنچنی اور ڈومنی پر نو لاکھ ساٹھ ہزار سالانہ خرچ کیا کرتے تھے،

ہر خانقاہ کے لیے سلاطین نے بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کے متولی اور سجادہ نشین اپنے اسلاف کی روایت کے خلاف مالدار، دیہہ دار اور جاگیردار بن بیٹھے، اور ان میں نفس کشی کے بجائے نفس پروری، ریاضت و عبادت کے بجائے امارت و جاہ پسندی اور فقر و فاقہ کے بجائے تن آسانی اور راحت پروری آگئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلاطین پہلے ان کی بارگاہ میں جبیں سائی کرتے تھے لیکن اب وہ خود ان کے فیض و کرم کے زلہ ربا ہوگئے، دارا شکوہ کے پیر ملا جیو اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ جس طرح میں دارا کے حال کی طرف متوجہ رہتا ہوں تم بھی رہا کرو، اگر تم اس کی طرف متوجہ نہ ہوگے تو خدا سے پھر جاؤ گے، وہ اپنے مریدوں سے

دارا شکوہ ہی کی صورت کا مراقبہ کرنے کی تلقین کرتے تھے، آگے چل کر محمد شاہ رنگیلے نے اپنے زمانے میں ایک صوفی شاہ مبارک کو برہان الطریقت کا خطاب دیا، اور ایک دوسرے بزرگ شاہ بدا کو برہان الحقیقت کے لقب سے نوازا، اور شاہ رمز کو فصیح البیان کا خطاب دیا،

آخری دور میں حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادی، حضرت شاہ نظام الدین اورنگ آبادی اور حضرت شاہ فخر الدین دہلوی جیسے بزرگوں نے صوفیۂ کرام کے استغناء کی عظمت اور توکل کی شان کو برقرار رکھنے کی ضرور کوشش کی، لیکن دنیا دار صوفیہ کی وجہ سے خانقاہوں کی اہمیت بھی جاتی رہی، اور جہاں علم، معرفت، تقوی، دینداری، اخلاص، استغناء، توکل، حقوق العباد، حقوق اللہ اور تہذیب نفس کی بہترین تعلیمات حاصل ہوا کرتی تھیں، وہاں معرفت فروشی، مردم فریبی اور تصوف کی دوکان داری ہونے لگی، خواجگان چشت کی تعلیم یہ تھی، کہ سالک تمام دنیا دی آلائشوں سے پاک رہے، حتی کہ وہ اپنے رزق سے بھی بے غم رہے، اور اگر اس کے لیے اندوہ گیں رہتا ہے، تو وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے، کیونکہ خداوند تعالیٰ خود اس کا رزق اس کے پاس پہنچائے گا، پھر بھی اس کا توکل یہ ہونا چاہیے کہ اس کو جو کچھ بھی ملے راہ خدا میں دیدے، اور اگر رزق جمع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی تمام عنایتوں سے محروم ہو جاتا ہے، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے ایک مکتوب میں فرمایا کہ فقیروں پر لازم ہے کہ وہ اپنے کو ہمیشہ ذلیل، محتاج اور مسافر سمجھیں، روتے اور التجا کرتے ہوئے زندگی گذاریں، اور اپنے عیبوں کو دیکھتے، گناہوں کے غلبہ کا مشاہدہ کرتے اور علام الغیوب سے ڈرتے رہیں، اپنی نیکیوں کو تھوڑا سمجھیں اگرچہ بہت ہوں، اور اپنی برائیوں کو بہت خیال کریں، اگرچہ تھوڑی ہوں، اور مخلوق میں مشہور اور مقبول ہونے سے ڈرتے رہیں لیکن یہ تمام شرائط جاگیردار صوفیہ نے پوری نہیں کیں، اور جن کو جاگیریں نہیں ملیں وہ عملیات، تعویذوں اور گنڈوں کے ذریعہ مشہور ہو کر رزق جمع کرنے کی فکر میں لگے رہے،

ایسے ہی ریاکار صوفیہ کے نمونے دیکھ کر علما کا ایک گروہ نہ صرف ان کا مخالف بلکہ سلوک و تصوف کا بھی نکتہ چیں رہا،

علما اور صوفیہ | اور یہ عجیب بات ہے کہ تمام اکابر صوفیہ نے علما ہی کی طرح تعلیم حاصل کی لیکن علما اور صوفیہ کی تفریق خوامخواہ پیدا ہو گئی، حضرت بختیار کاکیؒ نے تمام ظاہری علوم کی تعلیم پائی تھی، حضرت بہاء الدین زکریا سہروردیؒ نے کلام پاک ساتوں قراءتوں کے ساتھ حفظ کیا تھا، اور پندرہ سال تک خراسان اور بخارا میں تحصیل علم کرتے رہے، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ نے بھی کلام پاک حفظ کیا، اور فقہ کی کتاب نافع مولانا منہاج الدین ترمذی سے پڑھی، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ راہ سلوک کی ابتدائی منزل میں کسی شرعی مسئلہ پر غور و فکر کر رہے تھے کہ ایک مجذوب نے آکر کہا کہ مولانا نظام الدین! علم بہت بڑا حجاب ہے، حضرت شیخ نظام الدین اولیا کے دل میں یہ بات کھٹکی کہ علم حجاب تو ہو سکتا ہے لیکن بڑا حجاب کیونکر ہو سکتا ہے، مجذوب نے کہا، جب اس جگہ پہونچو گے تو معلوم ہو جائے گا۔ اس کے بعد حضرت شیخ نظام الدین اپنے مرشد حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کی خدمت میں پہنچے اور مجذوب کی باتیں کہہ سنائیں، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ نے فرمایا کہ حجاب دو قسم کا ہوتا ہے، ایک ظلمانی، دوسرا نورانی، گناہ اور برائیاں ظلمانی حجاب ہیں، جو شخص ان سے توبہ کرے گا اس کا گناہ معاف کر دیا جائے گا، لیکن علم ایک نورانی حجاب ہے جس کو ہر شخص نہ عبور کر سکتا ہے اور نہ اس کے کنارے سے اٹھ سکتا ہے، جس وقت تک شرعی علوم میں دستگاہ نہیں ہوگی، خدا کی محبت، معرفت اور قربت حاصل نہیں ہو سکتی، اس لیے علم ایک بڑا حجاب ہوتا ہے،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے قدوری، حریری، مشارق الانوار کی باضابطہ تعلیم پائی، اور جب ان کی دستار فضیلت باندھی گئی تو بدایوں کے علماء اور مشائخ دونوں اس تقریب میں شریک تھے، ان کا شمار متبحر علماء میں بھی ہوتا رہا، ان کے مریدان کے علمی تبحر سے

بھی استفادہ کرتے تھے، اسی لیے ان کی خانقاہیں رشد و ہدایت کے ساتھ درس و تدریس کا بھی سلسلہ رہتا تھا،

اکابر صوفیہ کی علمی فضیلت کے معترف سب ہی ہوتے، مثلاً مولانا قطب الدین کاشانی دہلی آئے اور حضرت حمید الدین ناگوریؒ کی تصانیف پڑھیں تو اپنے ہمراہی علماء سے کہا کہ یاد رکھو جو کچھ ہم نے اور تم نے پڑھا ہے وہ سب ان تصانیف میں موجود ہے، اور جو کچھ نہیں پڑھا ہے وہ علم بھی ان کتابوں میں موجود ہے، اسی طرح حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ، حضرت شیخ ابو الفتح رکن الدین، حضرت شیخ برہان الدین غریب، حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ، حضرت شرف الدین احمد منیریؒ، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ، حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ، حضرت بہاء الدین نقشبندی، حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ اور دوسرے اکابر مشائخ کا درجہ علوم ظاہری میں جید علماء سے کم نہیں، لیکن اس حقیقت کے باوجود علماء اور صوفیہ کی تفریق پیدا ہوگئی، اور غلط یا صحیح وہ دو علٰحدہ علٰحدہ گروہ سمجھے گئے، اور بڑی چھوٹی بہت سی باتوں پر دونوں میں اختلافات پیدا ہوتے رہے۔

شریعت و طریقت کا جھگڑا

علماء کو صوفیہ سے اختلاف کا بڑا سبب یہ تھا کہ وہ برابر ڈرتے رہے کہ کہیں طریقت اور حقیقت کے مسائل و افکار میں شریعت گم ہو کر نہ رہ جائے، حالانکہ جتنے اکابر صوفیہ گذرے ہیں، وہ برابر یہ کہتے رہے کہ جس طرح آفتاب سے نور، جوہر سے عرض اور موصوف سے صفت جدا نہیں ہو سکتی، اسی طرح شریعت حقیقت سے علٰحدہ نہیں ہو سکتی، خود حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ کی یہ تعلیم رہی کہ صوری حیثیت سے اخلاق کی تکمیل یہ ہے کہ سالک اپنے ہر کردار میں شریعت کا پابند ہو جب اس سے کوئی بات خلاف شریعت سرزد نہ ہوگی تو وہ دوسرے مقام پر پہنچے گا، جس کا نام طریقت ہے، اور جب اس میں ثابت قدم رہے گا تو معرفت کا درجہ

حاصل کرے گا، اور جب اس میں بھی پورا اترے گا تو حقیقت کا مرتبہ پائے گا، اس کے بعد وہ جو کچھ مانگے گا اس کو لے گا، اسی لیے خواجہ صاحب نے شریعت کے تمام ارکان اور جزئیات کی پابندی پر زور دیا ہے، اور یہی مسلک چشتیہ سلسلہ کے تمام بزرگوں کا رہا،

سہروردیہ سلسلہ میں حضرت صدر الدین عارفؒ فرمایا کرتے تھے کہ ایمان کی استقامت کی علامت یہ ہے کہ بندہ اللہ اور رسول کو محبوب رکھے اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تمام پیغمبروں میں افضل سمجھے، اور جو کچھ آپ نے فرمایا اس کو صحیح اور درست سمجھے، خواہ یہ باتیں عقل میں آئیں یا نہ آئیں، اگر نہ آئیں تو بھی ان کو تسلیم کرے تاکہ اعتقاد درست رہے، کیونکہ خود رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے حکم کو جانا اور اس کی کیفیت کو معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی،

فردوسیہ سلسلہ کے بزرگوں میں حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے اپنے مکتوبات میں فرمایا ہے کہ شریعت کے بغیر راہ سلوک میں قدم رکھنا جہالت اور ہلاکت ہے، شریعت سے طریقت اور طریقت سے حقیقت معلوم ہوتی ہے، ایک سالک کو شریعت سے واقفیت نہیں تو وہ طریقت اور حقیقت سے آگاہی نہیں حاصل کر سکتا ہے، حقیقت بغیر شریعت کے زندقہ اور شریعت بغیر حقیقت کے نفاق ہے،

حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے ہر مکتوب میں مکتوب الیہ کو شریعت کی پابندی کی تعلیم و تلقین کرتے ہیں، وہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ صدیقین کی دلی آرزو اور اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ حضرت مصطفٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کمال متابعت سے مشرف ہو جائے، اسکے سوا سب کچھ جھوٹے وہم اور بیہودہ خیالات ہیں، سلامت وہ شخص ہے جس نے ہدایت پائی اور حضرت مصطفٰی علیہ و آلہ الصلوٰۃ والسلام کی متابعت کو ہمیشہ لازم جانا۔

لیکن رفتہ رفتہ صوفیہ میں کچھ ایسا گروہ بھی پیدا ہو گیا جو یہ کہتا کہ ایمان کی علت معرفت ہے، اگر معرفت ہو اور طاعت نہ ہو تو اللہ تعالیٰ بندہ سے مواخذہ نہ کرے گا، لیکن طاعت ہو اور معرفت نہ ہو تو بندہ نجات نہیں پائے گا،

کچھ ایسے صوفیہ بھی پیدا ہوگئے جو اپنے کو قلندر کہتے، نماز نہیں پڑھتے اور روزے نہیں رکھتے، انکے ترک فرائض کی یہ تاویل کیجاتی کہ یہ لوگ ایک وقت اور ایک حال میں اسی طرح اور جسد کے ساتھ کئی جگہ دکھائی دیتے ہیں، اس لیے ایک جگہ تو بظاہر تارک فرائض نظر آتے ہیں لیکن اسی وقت وہ دوسری جگہ فرض بجا لاتے ہیں، کچھ ایسے صوفیہ بھی ہوگئے جو اپنے کو مجذوب کہتے اور شریعت کی کوئی پابندی نہ کرتے، ان کے بارہ میں کہا جاتا کہ وہ عالم جنون میں رہتے ہیں اور مجنون پر تکلیفات شرعیہ نہیں،

علماء کی نظروں میں یہ باتیں کھٹکتیں، گو اکابر صوفیہ خود اس کی تردید کرتے رہتے کہ وہ معرفت پسندیدہ نہیں، جس میں طاعت نہ ہو، ان کے نزدیک معرفت شوق اور محبت کا نام ہے، شوق اور محبت کی علامت طاعت ہے، شوق اور محبت جس قدر زیادہ ہوتی جائیگی، اسی قدر فرمان الٰہی کی تعظیم بڑھتی جائے گی، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے تو ایسے صوفیہ پر لعنت بھیجی ہے، جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ حقیقت کا جب کشف ہوجاتا ہے تو پھر شریعت کی ضرورت باقی نہیں رہتی، انھوں نے تو کتاب، سنت اور اجماعِ امت کی تقلید کو ہر حال میں ضروری قرار دیا ہے، اور دوسرے خانوادوں کے بزرگوں کو بھی یہی تعلیم رہی،

لیکن اکابر صوفیہ کے اس مسلک کے باوجود کچھ ریاکار متصوفین ایسے بھی تھے جو نماز کے پابند نہ ہوتے اور کہتے کہ وہ عالم سکرات میں ہیں، عریاں رہتے اور لوگوں کو یقین دلاتے کہ عالم جذب میں ہیں، حسن پرست ہوکر ہوسناک بنجاتے لیکن اعلان کرتے کہ اس طرح ذات الٰہی کی صفتِ جمال کے مشاہدہ میں مشغول ہیں، عشق مجازی کی بوالہوسی میں مبتلا رہتے لیکن عشق حقیقی کا دم بھرتے، گمرہی اور ضلالت اختیار کیے ہوتے، لیکن اناالحق کا نعرہ لگاتے اور دوسروں کو باور کراتے کہ خداوند تعالیٰ کی روح ان میں حلول کرگئی ہے، ٹونے ٹوٹکے اور جادو کرتے لیکن ان کو کشف و کرامات کہتے، ایسے متصوفین نے محض دنیاوی مال و منال اور جاہ و حشمت کی خاطر اپنے کو صوفی ظاہر کرکے تصوف کو بدنام کیا، پاک نہاد صوفیہ بھی ان کو برا سمجھتے لیکن علما کا ایک گروہ ان ہی کے نمونے دیکھ کر تصوف کا ناقدر رہا۔

(باقی)

کچھ مظہر کے بارے میں

از جناب پروفیسر سید حسن صاحب پٹنہ

عہد تغلق کے ایک نیم گمنام مگر اہم فارسی شاعر مولانا مظہر کے بارے میں اب تک تین مقالے لکھے جاچکے ہیں، ایک ڈاکٹر وحید مرزا کا ہے، دوسرا مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم کا، اور تیسرا ڈاکٹر شمعون اسرائیلی کا، ڈاکٹر وحید مرزا کا مقالہ خاصا بسیط ہے، جو مئی ۱۹۳۵ء کے اورینٹل کالج میگزین لاہور میں شائع ہوا تھا، فاضل مقالہ نگار کو شاعر کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ[۱] دستیاب ہوگیا تھا، مقالہ اسی کی بنیاد پر سپرد قلم ہوا ہے، میگزین کے اڈیٹر نے متفرق تذکروں سے مظہر کے حالات نقل کرکے مقالہ کے شروع میں اضافہ کردیا ہے اور اگست ۱۹۳۵ء کے شمارے میں ملا محمد صوفی مازندرانی کے تذکرے "بتخانہ"[۲] سے مظہر کے بہت سے اشعار نقل کرکے بطور ضمیمۂ مقالہ شائع کردیے ہیں، مولانا شروانی مرحوم کا مقالہ[۳] نقائد مظہر کے اُس مخطوطے پر مبنی ہے جو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے کتاب خانے میں دریافت ہوا تھا، یہ انکشاف بھی اسی زمانے میں ہوا جب ڈاکٹر وحید مرزا نے حکیم آشفتہ لکھنوی کے نسخے پر مقالہ لکھا تھا، ڈاکٹر شمعون اسرائیلی[۴] کا مضمون انگریزی زبان میں ہے، اور شاید ابھی تک کہیں شائع نہیں ہوا ہے، راقم الحروف نے اس کی ایک ٹائپ شدہ کاپی دیکھی ہے، یہ بھی علی گڈھ کے نسخے ہی پر مبنی ہے،

تینوں مقالہ نگاروں نے مظہر کے نام، وطن اور حالات زندگی کے بارے میں بڑی کد و کاوش

---

[۱] مملوکہ جناب حکیم آشفتہ لکھنوی، خدا معلوم یہ مخطوطہ ہنوز موجود ہے یا نہیں [۲] نسخہ مملوکہ بوڈلین لائبریری [۳] یہ طویل مقالہ رسالہ معارف کے دو شماروں میں (بابت جولائی اور اگست ۱۹۳۵ء) شائع ہوا [۴] ریڈر شعبۂ فارسی علی گڈھ مسلم یونیورسٹی،

سے جستجو کی ہے، اور تذکرہ نگاروں کے اقوال کے علاوہ خود شاعر کے کلام سے اسکے بارے میں معلومات اخذ کیے ہیں، ان کی تحریروں کا ماحصل یہ ہے کہ مظہر کا اصلی نام اور ولدیت، تاریخ ولادت اور زمانۂ وفات کچھ معلوم نہیں ہیں، تذکروں میں بھی اس کا ترجمہ بہت مختصر اور غیر تشفی بخش ہے، ڈاکٹر وحید مرزا کی تحقیق کے مطابق مظہر نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ سلطان فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ تا ۷۹۰ھ) کے عہد میں گذارا، اور ایک قصیدہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سلطان فیروز کے بیٹے اور جانشین سلطان ناصر الدین محمد شاہ کے وقت میں بھی موجود تھا، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں، ان کے خیال کے بموجب مظہر کا زمانہ ۷۱۶ھ سے ۹۱-۷۹۰ھ تک متعین ہوتا ہے، یعنی وہ حافظ شیرازی کا ہم عصر تھا۔

جن تذکروں میں مظہر کا کچھ حال ملتا ہے ان میں سب سے قدیم اخبار الاخیار و تذکرہ مصنفین دہلی از شیخ عبدالحق دہلوی، منتخب التواریخ بدائونی، اور بتخانہ، مولفہ ملا صوفی مازندرانی ہیں، شیخ عبدالحق دہلوی، اور بدائونی نے مظہر کو کڑا کا باشندہ بتایا ہے، اور عبد اللطیف بن عبد اللہ عباسی ساکن احمد آباد گجرات نے جس نے بتخانہ میں اضافے اور اس کے شروع میں شعراء کے تراجم شامل کیے، لکھا ہے کہ مظہر باہر سے ہندوستان آیا تھا، اس اختلاف کی بنا پر تینوں مذکورۂ صدر فاضل مقالہ نگاروں نے حقیقت کی جستجو کی ہے، لیکن تینوں اپنے اپنے طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مظہر ہندوستان کا باشندہ تھا، راقم السطور کا خیال ہے کہ مظہر کے وطن کے بارے میں تینوں مقالہ نگاروں کا فیصلہ غلط فہمی پر مبنی ہے، اس سلسلہ میں عبد اللطیف عباسی کا یہ قول بہت اہم ہے کہ

"از اقوالش ظاہر میشود کہ بہند آمدہ[1] و مداح سلطان فیروز شاہ و اعیان دولت او بودہ عمرش بمنزل ثمانین رسیدہ بود"[2]

---

[1] منقول از اورنٹیل کالج میگزین، معلوم ہوتا ہے کہ نقل کرنے میں یہاں کچھ حذف ہوگیا ہے، ممکن ہے کہ اس طرح ہو "از ایران بہند آمدہ"۔ [2] نقل از اورنٹیل کالج میگزین بابت مئی ۱۹۳۵ء، ص ۱۱۳

افسوس ہے کہ تینوں مقالہ نگاروں کو مظہر کا کوئی ایسا شعر دیوان میں نہ ملا جس سے اس معاملے پر صریح روشنی پڑتی، معلوم ہوتا ہے کہ مظہر کے کلام کا وہ حصہ جس میں اس نے اپنے وطن کی طرف اشارہ کیا ہوگا، دیوان سے غائب ہوگیا ہے، اخبار الاخیار، تذکرہ مصنفین دہلی، منتخب التواریخ اور احوال الشعراء مولفہ عباسی تینوں تقریباً ایک ہی عہد کی تالیفات ہیں، اسی زمانے کا ایک اور اہم تذکرہ عرفات العاشقین مولفہ تقی اوحدی بھی ہے، یہ تذکرہ تینوں مقالہ نگاروں میں سے کسی کی نظر سے نہیں گذرا ہے، عرفات میں مظہر کا دو جگہ ذکر آیا ہے، ایک جگہ "مولانا مظہر" اور دوسری جگہ "قاضی مظہر کڑہ" کا عنوان دیا گیا ہے، لیکن آخر میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ طرز اشعار دونوں کے یکساں ہیں، عرفات کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

"مولانا مظہر: از افاضل زماں و سخنوران کامل بیانست، مادح بادشاہان ہند و گجرات، قریب ہشت ہزار بیت دیدم طبعی با مزہ و شعری ہموار و سلیس دارد، قائل (کذا)، گویند اصلش از ایرانست"

اس کے بعد اشعار کا انتخاب ہے، پھر یہ عبارت ملتی ہے:۔

"در نسخہ ای[1] ہفت ہشت قصیدہ از قاضی مظہر کڑہ بنظر مخلص رسید کہ مداح فیروز شاہ بودہ و مدح عین الملک نیز نمودہ و بزعم الکثروی غیر مظہر گجراتی مذکور است، اگرچہ طرز یکیست، واللہ اعلم"

اس کے بعد پھر اشعار نقل ہوئے ہیں،

تقی اوحدی کے بیانات سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ مظہر کے دیوان میں

---

[1] علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں ایک اور نسخہ قصائد مظہر کا ہے جس میں تقریباً اسی تعداد میں قصیدے ہیں، کیا عجب ہے کہ یہ وہی نسخہ ہو جسے اوحدی نے دیکھا تھا،

تقریباً آٹھ ہزار ابیات تھے، حکیم آشفتہ لکھنوی کا نسخہ ناقص ہے، اس میں صرف دو ہزار سے کچھ فاضل اشعار ہیں، مخطوطہ علی گڑھ میں بھی تقریباً ساڑھے پانچ ہزار ابیات ہیں بتخانہ میں اشعار کا انتخاب ہے، اس لیے ایسے اشعار جن میں مظہر نے اپنے وطن کا نام لیا ہوگا، یقیناً مفقود ہو چکے ہیں۔ دوسرے یہ کہ تقی اوحدی کے زمانے میں یہ بات مشہور تھی کہ مظہر ایرانی الاصل ہے، تذکرہ مجمع الفصحا میں عرفات کی تقلید کی گئی ہے، اور اوحدی کے اقوال کو دوسرے الفاظ میں نقل کر دیا گیا ہے، احوال الشعراء اور عرفات کے بیانات کو رد کر کے یہ فیصلہ کر دینا کہ مظہر کا وطن اصلی کڑا تھا، اور وہ ہندوستانی نژاد تھا، کچھ مناسب نہیں ہے، ہم لوگوں کے اعتبار سے مولفین عرفات و احوال الشعراء یقیناً دور مظہر سے قریب تر تھے اور ان کے پاس رائے قائم کرنے کے لیے بہتر مواد موجود تھا یعنی خود شاعر کا مکمل دیوان۔ مجمع النفائس اور مخزن الغرائب کے مولفین نے بھی وطن کے بارے میں کوئی قطعی بات نہیں لکھی ہے، البتہ صبح گلشن میں اس کو سیدھے 'متوطن شہر کڑا' لکھ دیا گیا ہے، مولف نزہۃ الخواطر نے بھی اس کے حوالے سے یہی بات لکھ دی ہے، اور نٹیل کالج میگزین کے ایڈیٹر نے بھی مظہر کے ہندی الاصل ہونے میں شبہ ظاہر کیا ہے، ڈاکٹر شمعون اسرائیلی صاحب نے بدائونی کی اس عبارت " دیگر مولانا مظہر کڑہ است کہ اولادش حالا در بلدۂ لکھنؤ ساکن اند و آباعن جد معزز و محترم آمدہ اند۔" سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ خود مظہر کے آبا و اجداد معزز و محترم رہے ہیں، حالانکہ یہاں مقصد مظہر کی اولاد سے ہے، مظہر اور بدائونی کے درمیان تقریباً تین سو سال کا فرق ہے یعنی اولاد مظہر کی کئی نسلیں گذر چکی ہوں گی۔

کچھ عرصہ ہوا ایک ایسی تحریر پڑھنے کا اتفاق ہوا جس سے مظہر کے نام و وطن کے متعلق مزید تفتیش و تحقیق کی راہ نکل آئی ہے، تقریباً بیس سال ہوئے ڈاکٹر قاسم غنی نے عصر حافظ پر ایک معرکۃ الآرا کتاب لکھی ہے[1] جس میں اس موضوع پر نہایت دقت نظر اور ہوشمندی کے ساتھ عالمانہ تبصرہ اور اس ضمن میں حافظ کے معاصرین کا بھی تذکرہ کیا ہے، اس کتاب کے صفحات ۲۳۰ تا ۲۳۴ کے حاشیے میں ایک شاعر عز الدین مظہر کا بھی ذکر آگیا ہے، تاج الدین احمد وزیر نے ۷۸۲ھ میں ایک جُنگ (بیاض) مرتب کی تھی جس میں اس نے اپنے ہمعصر متعدد علماء و فضلا سے خود ان کے ہاتھوں سے کچھ لکھنے کی فرمائش کی تھی، اس جُنگ کا ایک نسخہ اصفہان کے میونسپل (شہرداری) کتاب خانے میں محفوظ ہے، اس کے چودہ صفحے عز الدین مظہر مذکور کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے ہیں، عز الدین مظہر شاہ شجاع (۷۳۳ھ تا ۷۸۶ھ) فرمانروائے شیراز و کرمان و یزد کے ہمزبان شعراء و فضلا میں شمار ہوتا تھا، ان چودہ صفحوں میں مظہر کے قصائد، غزلیں اور رباعیاں درج ہیں شروع صفحے پر یہ عبارت تحریر ہے:-

"مما نصح عن لطائف المرتضی الاعظم صاحب جوامع الکلم
فی نوابغ الحکم عز الملۃ والدین مطہر اعلی اللہ شانہ"

اور اس حصے کے آخر میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:-

"حررہ العبد الاضعف افقر عباد اللہ الغنی مطہر بن عبداللہ
بن علی الحسنی، احسن اللہ حالہ وحقق آمالہ تذکرۃ لصاحبہ الصاحب
الاعظم مستجمع مکارم الاخلاق و محاسن الشیم خواجہ تاج الدولۃ
والدین احمد عظم اللہ قدرہ فی منتصف رجب المرجب
لسنۃ اثنی و ثمانین و سبعمائۃ حامداً و مصلیاً لرسولہ"

اس بیاض سے ڈاکٹر قاسم غنی نے مظہر کا ایک طویل قصیدہ نقل کیا ہے جو شاہ شجاع کی مدح میں لکھا گیا ہے، قصیدہ کے ابتدائی اشعار یہ ہیں:-

حذر کن ای دل از آسیب روزگار، حذر — کہ چرخ شعبدہ بازاست و دہر حیلت گر

[1] بحث در آثار و افکار و احوال حافظ جلد اول، تاریخ عصر حافظ از دکتر قاسم غنی تہران ۱۳۲۱ھ شمسی

بہیچ وجہ مبین مہر این سپہر دو روی
بہیچ باب منہ دل درین سرای دو در

طمع مکن گہر خوشدلی و بہرہ وری
کہ ہست طارم پیروزہ نیک بدگوہر

زہیچ خشک و تر اندر ترازوی خرد امت
جہان دہر چہ بود در جہان چہ خشک و چہ تر

بدست دیو شقا خاتم بقا مسپار
بپای پیک ہوس شہرزہ ہوا مسپر

چو جان ثبات ندارد زبند جان پرہیز
جہان چو میگذرد از سر جہان بگذر

متاع عمر گرانمایہ رایگان مفروش
برای سود و زیان عشوہ سپہر مخر

چو یادگار بشر نیست در جہان جز نام
بخیر کوش کہ نامت بخیر بہ کہ بشر

مدح کے اشعار ملاحظہ ہوں :-

ستودہ داور دوران خدیو دارائی
خجستہ خسرو عادل دل سکندر در

جہان پناہ فلک جاہ خسروی کہ گرفت
فلک ز فرش قدر و جہان ز قدرش فر

بعقل تابع حکم خدا و دین رسول
بفضل جامع علم علی و عدل عمر

جلال دنیی و دین زیب ملک شاہ شجاع
ابو الفوارس غازی پناہ فتح و ظفر

زہی ضمیر تو در پردۂ قضا رہبر
دل منیر تو از سرّ غیب دادہ خبر

شدہ عبارت تو از مقاطر اقلام
فریب عارض دلدار و طرّۂ دلبر

بحسن صورت لفظ تو زینت معنی
بلطف شیوہ خط تو زیور دفتر

بیاض معنی بکر از سواد خط خوشت
چو نور ایمان تابندہ از دل کافر

آخر قصیدہ کے چند اشعار یہ ہیں :-

جہان پناہا در مدح ذات طاہر تو
شدست شعر مظہر زآب خضر اطہر

دلی چو مہر ضمیرت شعاع علم زند
کجا فروغ دہد نور ذرۂ احقر

مظہرا چو بعجز اعتراف بنمودی
رخ نیاز سوی قبلۂ دعا آور

ہمیشہ تا کہ بود مجمع ستارہ سپہر
مدام تا کہ بود مطلع خور از خاور

در تو مطلع خورشید سلطنت بادا
سپہر باد ترا چاکر و ستارہ حشر

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عزالدین مظہر بن عبداللہ مادح شاہ شجاع وہی مظہر ہے جو ہندوستان کے فرمانروا سلطان فیروز شاہ تغلق کا مدیح نگار ہے، اور جس کو بعض تذکرہ نگاروں نے کڑا کا باشندہ بتایا ہے، راقم الحروف کا قیاس ہے کہ دونوں مظہر ایک ہی شخص ہیں ورنہ ایک ہی زمانے میں ہندوستان و ایران میں ایک ہی تخلص کے دو شاعر اور قصیدہ نگار کا موجود ہونا بہت ہی عجیب و غریب بات ہے، تذکرہ نگاروں نے مظہر کا صرف تخلص لکھا ہے نام نہیں بتایا ہے۔ جُنگ مذکور میں اس کا نام عزالدین لکھا ہے، مآثر الامراء اور تاریخ فرشتہ میں عہد فیروز شاہ کے ایک شاعر عزالدین کا نام لیا گیا ہے، جس نے ٹھٹھ کی فتح کے موقع پر بعض سنسکرت کی کتابوں کا نظم میں ترجمہ کر کے سلطان فیروز شاہ کو پیش کیا تھا، گمان ہوتا ہے کہ یہ وہی عزالدین شاعر ہے جس کا تخلص مظہر ہے۔ مظہر کا ایک قصیدہ بھی موجود ہے جو اس نے اسی فتح کی تہنیت میں لکھا تھا،

مظہر ہندوستان کب آیا؟ اس سوال کا جواب قطعی طور پر دینا محال ہے، مظہر نے سلطان فیروز شاہ کی مہم جاجنگر کا حال ایک قصیدہ میں لکھا ہے، یہ مہم سنہ ۷۶۰ھ میں انجام پائی تھی، اور ٹھٹھ کی فتح سنہ ۷۶۱-۶۲ھ میں حاصل ہوئی، اس کا مطلب یہ ہے کہ مظہر ان ایام میں ہندوستان میں موجود تھا، ایک قصیدہ میں سنہ ۷۶۷ھ کا ذکر ہے۔

ترا بہفصد و ہفتاد ہجر مدت عمر
چو عمر نوح نبی باد ہفصد و پنجاہ

تاج الدین احمد وزیر کے جُنگ کی کتابت سنہ ۷۸۲ھ میں ہوئی، اس میں جو عربی عبارت

مظہر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، وہ بھی اسی سال کی ہے، جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اس زمانے میں ایران میں تھا، اس سے مظہر کے معاملے کی پیچیدگی میں اضافہ ہو جاتا ہے، اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ مظہر کی ایران و ہندوستان میں آمد و رفت رہی ہے تو یہ گتھی بھی بہت حد تک سلجھ جاتی ہے، شاہ شجاع کا انتقال ۷۸۶ھ میں ہوا، قیاس ہے کہ اس کے بعد مظہر ایران کی سکونت آخری بار ترک کر کے ہندوستان چلا آیا اور سندھ کے راستے سے ہو کر گجرات میں اقامت پذیر ہو گیا، عہد قدیم میں ایران و ہندوستان کے درمیان آمد و رفت اسی راستے سے ہوا کرتی تھی، احمد آباد اور گجرات میں مظہر کے دیوان کا دستیاب ہونا اسی امر کا ثبوت ہے، چنانچہ سراج الدین علی خاں آرزو نے مجمع النفائس میں مظہر کو گجراتی ہی لکھا ہے، ریاض الشعراء میں بھی واضح طور سے بیان کیا گیا ہے کہ "از ایران آمدہ بگجرات توطن نمود" اور قرائن بھی کہتے ہیں کہ یہی درست ہے، تاریخ فرشتہ میں عزالدین کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ اس نے بعض پرانی سنسکرت کتابوں کا فارسی نظم میں ترجمہ کر کے سلطان فیروز شاہ کی خدمت میں پیش کیا، ممکن ہے کہ مظہر نے گجرات میں اقامت کے دوران میں سنسکرت سیکھی ہو، جس طرح ابوریحان البیرونی نے سیکھی تھی، یا ان کتابوں کا کسی سے ترجمہ کرا کے سنا ہو، اور ان مطالب کو فارسی میں نظم کر دیا ہو،

چند اور چیزیں بھی ہیں جو مظہر ایرانی اور مظہر ہندوستانی کو ایک ہی شخص مان لینے میں ہماری مدد کرتی ہیں،

ڈاکٹر قاسم غنی نے عزالدین مظہر کو شاہ شجاع کے عہد کے ممتاز شعراء و فضلاء میں شمار کیا ہے، تاج الدین احمد وزیر نے اپنے جُنگ میں مظہر کے لیے جو القاب استعمال کیے ہیں، ان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مظہر ہندی کو بھی اپنے علم و فضل پر ناز ہے، اور وہ بار بار اس کا چرچا کرتا ہے،

گفتا بہ از ہنر چہ وسیلت بود ترا　　کاندر زمانہ نادرۂ در جمیع اب

در شعر و در بدیہہ و در وعظ و در مثل　　در رمز و در لطیفہ و در خط و در کتاب

در علم و فضل نیست چو من مفتی و حکیم　　در نظم و نثر نیست چو من شاعر و دبیر

مظہر کے قصیدوں سے بھی اس کے علم و فضل کا اظہار ہوتا ہے،

دوسری قابل توجہ بات مظہر کی طویل عمری ہے، عبد اللطیف عباسی نے اس کا سن تقریباً اسّی سال بتایا ہے، لیکن خود مظہر نے اپنے کو پیر صد سالہ لکھا ہے:

ساقیا جام ارغوانی دہ　　وز میم عمر جاودانی دہ

پس بجام دو زاں سہ سالہ مدام　　"پیر صد سالہ" را جوانی دہ

تا رود ناتوانی از تن ما　　بادہ چنداں کہ میتوانی دہ

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم کی تحقیق کے مطابق مظہر کا سال ولادت ۷۱۶ھ قرار پاتا ہے، اس اعتبار سے اس کی وفات ۸۱۶ھ کے قریب ہوئی ہوگی، اگر عزالدین مظہر شاہ شجاع کی وفات کے بعد ہندوستان چلا آیا تو اس کو یہاں مستقل طور پر تیس سال تک رہنے کا موقع ملا، کسی غیر ملک کو اپنا وطن بنانے کے لیے اتنی مدت کافی ہے، اسی عرصے میں وہ شمالی ہند کو منتقل ہو گیا ہوگا اور کڑا میں بود و باش اختیار کر لی ہوگی، یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تقی اوحدی نے مظہر کو قاضی مظہر لکھا ہے، "مجمع الفصحاء" میں بھی اسے "قاضی آگرہ" بتایا گیا ہے، عین ممکن ہے کہ مظہر کے علم و فضل کے پیش نظر اسے عہدۂ قضا پر مامور کیا گیا ہو اور وہ اسی سلسلے سے کڑا اور آگرہ چلا آیا اور یہاں سکونت اختیار کر لی،

مظہر کے جو اشعار اوریئنٹل کالج میگزین اور مولانا شروانی مرحوم کے مقالے میں نقل ہوئے ہیں ان کے بغور مطالعہ سے شاعر کے حالات و شاعری کے متعلق بعض نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں،

مظہر نے بتایا ہے کہ وہ کسی وقت صاحب مال و منال تھا، لیکن دولت سے زیادہ وہ

علم کا دلدادہ تھا، امراء و رؤسا، اس کی ملاقات وندیمی کے آرزومند تھے اور اس سے دربارداری کرانا چاہتے تھے،

گفتم ای دوست خبریافتہ باشی کہ مرا — بود جمعیت حالی و منالی موفور . . .

عشق من کنج و کتابی بد و مخدومان را — میل بدمدح وندیمی و ملاقات وحضور

ان 'مخدوموں' کی خواہش پوری کرنے میں اس کے محبوب مشغلے میں خلل کا اندیشہ تھا، اور اگر توجہ نہ کرتا تو دولت کے نقصان کا خطرہ تھا، اس لیے مظہر سخت خلجان میں مبتلا تھا، اسے یہ فکر دامنگیر تھی کہ وہ ایسی جگہ توطن اختیار کرے جہاں کا فرمانروا رافت وکرم میں مشہور ہو،

گرمراعات کنم علم و عمل راست خلل — وررعایت نکنم دہ و درم راست فتور

لاجرم خواستم از بہر نشستن جاہی — کہ بود والی آنجاہی برافت مذکور

کیا عجب ہے کہ اسی احساس و خواہش نے اسے ترک وطن پر مجبور کیا ہو،

مظہر کو اپنے حسب ونسب کا بھی تفاخر ہے،

آنکہ دارد حسبی تازہ تر از سرو چمن — وانکہ دارد نسبی پاک تر از ماء طہور

تاج الدین وزیر کے جُنگ میں بھی مظہر نے اپنا نسب حسنی بتایا ہے، اور مولف جنگ نے اسے عزالملت والدین کا لقب عطا کیا ہے،

اسی قصیدے میں ایک ایسا شعر ہے جس میں مظہر نے غالباً اپنے وطن کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس کا دوسرا مصرع دیوان کے تینوں نسخوں میں ناقص نقل ہوا ہے' وہ شعر یہ ہے:-

بخت میمونت بلنداست کہ آورد مرا — درجناب تو جدا گردہ زجنداں . . .

ایک قصیدے کے بعض اشعار سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مظہر ہندوستان میں تنہا تھا اور

اعزہ و احباب کی جدائی میں دن رات بیقرار، بے خواب اور اشکبار رہتا تھا:

ولی مباد کہ افتد چو من کسی تنہا — درایں چنیں قفسی از دیار واز احباب

کہ باشد از غم یاراں ہمیشہ دربارں — چو برق سینہ پرآتش چو ابر دیدہ پرآب

نہ در روانش سکونی بود نہ در دل صبر — نہ روز باش قراری زغم نہ شبہا خواب

گہی چو رعد بنالد ز درد تنہائی — گہی چو سیل براند ز چشمہا خوناب

گمان یہ ہوتا ہے کہ ابتداء میں مظہر تنہا ہندوستان آیا تھا، پھر یہاں مستقل طور پر سکونت اختیار کرنے کے بعد اپنے اعزہ واقارب کو اپنے پاس بلا لیا تھا، چنانچہ اس نے ناصرالدین محمد شاہ (جانشین سلطان فیروز تغلق) سے یہ درخواست کی کہ سابق سلطان نے جو جاگیر اسے عطا کی تھی وہ اس کی اولاد کے نام سے منتقل کر دیجائے، کیونکہ شاعر اب ضعیف و ناتواں ہوچکا ہے، رنج و ریاضت کے قابل نہیں رہا، سلطان ناصرالدین محمد شاہ ۷۹۹ھ میں تخت نشین ہوا، یہ درخواست یقیناً اسی زمانے میں یا اس کے بعد کی ہوگی، یعنی اس زمانے میں جب مظہر شاہ شجاع کی تخت سے معزولی یا موت کے بعد ہندوستان آکر کئی سال سے یہاں مقیم رہ چکا تھا،

مظہر نے اپنی شاعری کے ساتھ اپنی نثر نگاری کا بھی تذکرہ کیا ہے،

درعلم و فضل نیست چو من مفتی و حکیم — درنظم و نثر نیست چو من شاعر و دبیر

مظہر کا دیوان اشعار ناکمل و کمیاب ہی سہی دنیا میں موجود تو ہے، تذکروں میں بھی اسکے اشعار نقل ہوئے ہیں لیکن اس کی تالیفات نثر کا کچھ پتہ نہیں چلتا، تاج الدین احمد وزیر کے جنگ میں مولف نے مظہر کو صاحب "جوامع الکلم فی نوابغ الحکم" لکھا ہے، کیا عجب ہے کہ یہ مظہر کی نثری تالیف ہو،

مظہر کے اشعار کا مطالعہ کرنے سے اس کا ایک وصف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک سچا

شعر میں پے درپے ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن کے حروف آغاز ایک ہی ہوں، انگریزی علم بیان وبدیع میں یہ صنعت صنعت لفظی میں شمار ہوتی ہے، اور اس کا نام "تجانس حرفی" (Alliteration) ہے، ہندی شاعری کی بھی یہ ایک عام اور مرغوب صنعت ہے، اس سے شعر میں ایک خاص صوتی اثر پیدا ہوتا ہے، جو قاری یا سامع کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے، مظہر کے کلام میں ایسے اشعار کثیر تعداد میں موجود ہیں، چند نمونے ملاحظہ ہوں،

'سین' سے شروع ہونے والے الفاظ :

سنگیں دلی سہا دہنی سرو قامتی
سیمیں تنی ستارہ جبینی ستمگری

سکندر و جم و سلمت و سنجر و سہراب
سفندیار و سیاوش و سام و رستم و زال

بسماکیں سرو بر سمک الا رضش ساق
خود جہاں جای ندید ست کسی در آفاق

سمن ساق ترکی کہ ہندوی چشمش
سیہ سرمہ دارد کہ از سحر ماثل

ابتدا میں 'م' رکھنے والے الفاظ :

مقام و مفرش و مجمر و میوہ
مصاحب و می و معشوق و مطرب و مزمار

'ک' ہر کمندی کہ ز فتراک کمیں بکشاید
کمتریں صید بد و گہ دن اختر گیرند

'د' ز نہیب داز دو دل دہر فریبی نخوری
کہ شکمہ در دہن و دست بخنجر دارد

چند اور نمونے :

زیر ہر صفہ و ہر سقف سرای دگر است
پیش ہر ساحت و ہر صحن فضای دگر است

ہمہ از سنگ خام است و ستونہای زراق
ہمہ از مرصافیت ستون برافراق

ساقیا شبگیر شد شمع شبستانی بیار
بزم روحانی بنا کن جام ریحانی بیار

مرا چوں بوی تو دایم بجان نبود دوست
مرا چوں روی تو جنت بہشت ناید کار

ہر بیتے لطیف چو نو رستہ نادرین
گردی ز سرو قد و سمن ساق و سیمتن

از کام جو می نیک بنماید نوای نیل
دانند و ہان پیشہ نگنجد نوای پیل

شاہ شجاع کی مدح میں جو قصیدہ لکھا گیا ہے، اس میں بھی متعدد اشعار ایسے ہیں جو اس خصوصیت کے حامل ہیں، ملاحظہ ہوں :-

نسیم لطف تو پیرایۂ نعیم بہشت
سموم قہر تو سرمایۂ عذاب سقر

روا یح دم جاں بخش تست راحت روح
چنانکہ بر ورق گل وزد نسیم سحر

ز سہم تیر تو بشکستہ دست چرخ کماں
ز تاب تیغ تو افگندہ آفتاب سپر

ستودہ داور دوراں خدیو دارائی
نجستہ خسروی عادل دل سکندر در

بفضل تابع حکم خدا و دین رسول
بفضل جامع علم علی و عدل عمر

تذکرۂ نتجانۂ سے مظہر کے جو اشعار اورنٹیل کالج میگزین میں نقل ہوئے ہیں ان میں ایک یہ شعر بھی ہے،

آغاز شد ز ظلمت شب روشنی روز
زاں ساں کہ نور مومنی از جان کافری

شاہ شجاع کی تعریف میں عز الدین مظہر کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو :

بیاض معنی بکمر از سواد خط نوشت
چو نور ایماں تابندہ از دل کافر

دونوں اشعار کے مصراع ثانی کا مضمون توارد کے زمرے میں نہیں آسکتا، کیونکہ دونوں مصرعوں کا کہنے والا ایک ہی ہے،

مذکورہ بالا مفروضات کا خلاصہ یہ ہے کہ مظہر کا نام عز الدین تھا، اور اس کا باپ عبداللہ تھا، جس کا سلسلہ سادات حسنی سے ملتا ہے، مظہر ایرانی الاصل تھا، ایران سے ہندوستان میں اس کی آمد و رفت تھی، ایران میں شاہ شجاع کا مدح نگار رہتا،

ہندوستان آکر سلطان فیروز شاہ تغلق اور اس کے اعیان سلطنت کی مدح سرائی کی، شاہ شجاع کی معزولی یا موت کے بعد اس نے ترکِ وطن کر کے ہندوستان میں مستقل اقامت اختیار کرلی اور یہیں تقریباً ۸۱۶ھ میں وفات پائی،

اس کے اشعار کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صبح کا جلوہ اور مناظرِ سحر اس کے لیے خاص کشش رکھتے تھے، چنانچہ وہ بار بار اپنے قصیدوں کی تشبیب اور غزلوں میں مناظرِ صبح کی نقشہ کشی کرتا ہے، چند اشعار جن میں صبح کا سماں کھینچا یا اس کا ذکر کیا ہے، بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:۔

صبح چوں رایت سیمیں سحر برگیرند — طاس مہ بہ علم خسرو خاور گیرند
مجلسی خوبتر از جنت فردوس کنند — بادۂ صاف تر از چشمۂ کوہر گیرند

بامداداں کہ بیفگند ہوا پردۂ قار — شاہد صبح ببند و دلبرخی رخسار
آسمان نامۂ اعمال زمیں کرد سپید — شب تو گوئی کہ گنہ بود و سحر استغفار

چوں برآورد شہنشاہ فلک رایت نور — شد طراز علمش طلعت شعری عبور
صبح بر ظلمت شب تاخت بشمشیر جہانگ — فوج اسلام کند لشکر ہندو مقہور

بامداداں کہ منادی سحر در دیجور — ریخت بر مشک سیہ گرد سپید از کافور
آسماں دانۂ انجم چو فرو ریخت بخاک — غلغلی در چمن افتاد ز آواز طیور

ای باد صبحدم نفسی مشکناب دہ — وز بوی جانفزات نسیم گلاب دہ

میزند صبح سمن بوی دم از دلداری — میکند رنگ ریاحین چمن عطاری
در چنیں صبح دلآویز دم جاں پرور — کو گہ عیش و نشاطست دگہ میخواری
وقت سحر کہ زہرہ چہرہ دوشیزہ دختری — بنمود رخ ز گوشۂ گل بستہ چادری

آغاز شب ز ظلمت شب روشنی روز — زاں ساں کہ نور مومنی از جان کافری

سحرگاہست و ز مشرق ہمہ نور می بارد — ز شبنم در سر گلہا در شہوار می بارد

صبح شد سر ز خواب برگیرید — دور جام شراب برگیرید

صبح گاہست سر از خواب گران بردارید — بادہ خوابیدہ ز دل در دہناں بردارید

صبحدم غالیہ سایست صبا عنبر بیز — ابر کافور فشاں خاک چمن مشک آمیز

آغاز صبح و وقت صبوحست ای غلام — اینک ستارۂ سحری بر کنار بام

صبح چوں بنمود رخ شادی ز سر باید گرفت — مجلس نو دیگرہ بزم دگر باید گرفت
ساغری از حوض کوثر صاف تر باید کشید — دلبری از حور عین پاکیزہ تر باید گرفت

وقت صبحست صبوح می و مزمار کنید — بزم سازید و حریفاں ہمہ بیدار کنید

صبح در ز آسمان کشود اینک — دولت و بخت او نمود اینک

در دل صبح و سینۂ ساغر — این چہ صدق و صفاست می بینی

صبح شد پردہا بر اندازید — بزم را نقش دیگر اندازید

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم نے اپنے مقالے میں ان کتابوں کی ایک فہرست دی ہے، جو مظہر کے مطالعے میں رہی ہیں۔ اس فہرست میں دو اور ناموں کا اضافہ کیا جائے:

عوارف المعارف اور نصوص الحکم

ز عرفان 'عوارف' و وجدان 'نصوص'
ز وعظ و نصائح کتاب سری

(باقی)

خیام کا قدیم ترین تذکرہ

از

جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی، بی ٹی ایچ رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

روسی مستشرق زدکووسکی (Zhukovski) نے ۱۸۹۷ء میں دیگر رفقا کے ساتھ اپنے استاد وکٹر روزن (Victor Rozen) کی پروفیسری کی بست و پنج سالہ یادگار کے موقع پر Presentation Volume میں جو مقالہ لکھا تھا اس میں خیام کے حالات زندگی تمام قابل رسائی ماخذوں سے تاریخی ترتیب کے ساتھ نقل کیے ہیں، اس مقالہ کی رو سے قدیم ترین کتاب جس میں خیام کا حال دستیاب ہوا تھا شمس الدین محمد بن محمود الشہر زوری کی "نزہۃ الارواح و روضۃ الافراح" ہے، جس کا زمانۂ تصنیف حسب تحقیق ڈاکٹر سخاؤ مرتب الآثار الباقیہ ۵۸۶ھ اور ۶۱۱ھ کے درمیان ہے۔

لیکن ۱۹۰۶ء میں پروفیسر اڈورڈ براؤن نے اس رائے سے اختلاف کیا اور لٹریری ہسٹری آف پرشیا کی دوسری جلد میں لکھا کہ قدیم ترین کتاب جس میں خیام کا ذکر ملتا ہے نظامی عروضی سمرقندی کا "چہار مقالہ" ہے، ۱۹۱۰ء میں علامہ مرزا محمد بن عبد الوہاب قزوینی نے اس رائے کی تائید کرتے ہوئے لکھا:

"مقالۂ سوم برابط (اشتمال آں بر بعضے معلومات درخصوص خیام ..... و از آنجا اہمیت مخصوص است از یں کہ چہار مقالہ، و لیکن کتابے است کہ ذکرے از عمر خیام در آں شدہ، و ا... مصنف خود معاصر او بودہ و با وے ملاقات نمودہ است۔" (مقدمہ صفحہ د)

مگر حال ہی میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے اعزازی پروفیسر فارسی ڈاکٹر قاری کلیم اللہ حسینی نے

اس رائے کی صحت پر اعتراض کیا ہے، آخر ۱۹۵۹ء میں علی گڑھ میں جو آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا دوسرا اجتماع ہوا تھا اس کے لیے قاری صاحب نے ایک مقالہ مرتب کیا جس کا عنوان ہے "The Tatimmah Suwanul Hikmah of Zahiruddin Abdul Hasan Al-Bayhaqi" ۔ اس کے خلاصہ میں لکھا ہے :-

"تتمہ میں عمر خیام کے جو حالات ہیں وہ قدیم ترین ہیں، میری اس نئی دریافت سے پہلے تک نظامی سمرقندی کے چہار مقالہ کے متعلق شہرت تھی کہ وہ عمر خیام کے حالات میں قدیم ترین ذریعۂ معلومات ہے۔" (Summary of paper P.13)

کچھ دن بعد "اسلامک کلچر" (جنوری، اپریل ۱۹۶۰ء) کے اندر ڈاکٹر صاحب نے "ظہیر الدین البیہقی کی عربی و فارسی ادب میں خدمات" کے عنوان سے جو مقالہ لکھا اس میں مذکورۂ بالا دعوے کا اعادہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

"اس نئی دریافت سے پہلے تک نظامی عروضی سمرقندی کے چہار مقالہ میں عمر خیام کے حالات سب سے قدیم ترین تھے، پروفیسر ای، جی، براؤن نے لٹریری ہسٹری آف پرشیا (ایران کی علمی تاریخ) اور علامہ مرزا محمد قزوینی نے چہار مقالہ کے مقدمہ میں یہی لکھا ہے، علامہ کا یہ خیال ہے کہ چہار مقالہ میں خیام کے حالات اس کتاب کی ایک اہم جز ہے ......

لیکن یورپ کے کتب خانوں کی چھان بین میں جب ابو الحسن بیہقی کی تتمہ صوان الحکمہ کا پتہ چلا تو اسی کو خیام کے حالات کا قدیم ترین ماخذ سمجھنا چاہیے، کیونکہ یہ چہار مقالہ سے تین سال پہلے لکھی گئی، چہار مقالہ کی تکمیل ۵۵۲ھ میں ہوئی، اور تتمہ ۵۴۹ھ میں لکھی گئی۔"

(اسلامک کلچر، جنوری ۱۹۶۰ء ص ۱۵)

فاضل مقالہ نویس نے بغیر کسی دلیل کے یہ دعویٰ فرمایا ہے کہ "تتمہ صوان الحکمۃ" ۵۴۹ھ میں اور

"چہار مقالہ" اس کے تین سال بعد ۵۵۲ھ میں تالیف ہوئے ہیں اور اس لیے اول الذکر ثانی الذکر سے مقدم ہے۔ اس طرح ان کی اس "نئی دریافت" نے اساتذۂ قدیم کے نظریات پر خط نسخ پھیر دیا ہے، مگر اس قسم کے دعاوی کچھ مستحسن نہیں معلوم ہوتے، قطع نظر اس کے کہ یہ تقدیم و تاخیر خود محل نظر ہے (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) تین سال کا عرصہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا کہ اس کی بنا پر متاخرین کی "دریافتوں" کو متقدمین کے آراء کے نسخ و ابطال کا حق دیا جائے بالخصوص جبکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ عہد حاضر کی طرح قدماء میں اپنی تصانیف میں انکی تاریخ تدوین ثبت کرنے کا عموماً دستور نہیں تھا، اس لیے ان کے زمانۂ تصنیف کا تخمینہ بالعموم قرائن ہی کے ذریعہ لگایا جاتا ہے، بیشک شہرزوری کی "نزہۃ الارواح" سے "چہار مقالہ" اور "تتمہ صوان الحکمہ" دونوں مقدم ہیں (موخر الذکر تو نزہۃ الارواح کا ماخذ ہے) لیکن تصریحات کے فقدان کی صورت میں چہار مقالہ اور تتمہ صوان الحکمہ میں تقدیم و تاخیر کا فیصلہ بہت مشکل ہے، یہ دونوں معاصر ہیں، اور غالباً دونوں کی تصنیف کا زمانہ ایک ہی ہے، اگرچہ داخلی شواہد سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ چہار مقالہ کی تصنیف تتمہ صوان الحکمہ سے مقدم ہے نہ کہ موخر (جیسا کہ ڈاکٹر کلیم اللہ صاحب کا دعوی ہے)

چہار مقالہ کا زمانۂ تصنیف

چہار مقالہ کے زمانۂ تصنیف کے باب میں علامہ مرزا محمد بن عبد الوہاب قزوینی کی دو رائیں ہیں، تعلیقات میں انھوں نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

"پس تاریخ تالیف آں محصور می شود بین سنہ ۵۵۱-۵۵۲"

اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف نے چہار مقالہ میں دو جگہ سلطان سنجر سلجوقی (۵۱۱ھ-۵۵۲ھ) کا اس انداز میں ذکر کیا ہے گویا وہ زندہ ہے، چنانچہ صفحہ ۴۰ پر اس کے لیے دعا کی ہے: "اطال اللہ بقائہ وادام الی المعالی ارتقائہ"۔ صفحہ ۴۴ پر سنجر اور سلطان علاء الدین غوری کے لیے دعائیہ کلمات تحریر کیے ہیں: "خلد اللہ ملکہما وسلطانہما"

ان دعائیہ کلمات سے معلوم ہوتا ہے کہ "چہار مقالہ" سنجر کی زندگی میں تصنیف ہوا تھا، اس لیے یہ ۵۵۲ھ سے پہلے ہی تصنیف ہوا ہوگا، بعد میں نہیں، اس لیے تالیف چہار مقالہ کی انتہائی غایت ۵۵۲ھ ہے۔

پھر چونکہ نظامی عروضی صفحہ ۱۳ پر کاتب اور دبیروں کو مشورہ دیتا ہے کہ ادبائے قدیم کی کتابوں میں سے "مقامات بدیع و حریری و حمید" کا مطالعہ کرتے رہیں اور مقامات حمید سے مراد غالباً قاضی القضاۃ ابوبکر عمر بن محمود الملقب بہ حمید الدین المحمودی البلخی (المتوفی ۵۵۹ھ) کی "مقامات حمیدی" ہے، اور چونکہ "مقامات حمیدی" کا سال تحریر حسب تصریح حاجی خلیفہ (کشف الظنون جلد سادس صفحہ ۵۵) ۵۵۱ھ ہے، نیز اس کتاب کے اکثر مخطوطوں میں اور اسی طرح کانپور (۱۲۶۸ھ) اور طہران (۱۲۹۰ھ) کے اڈیشنوں کے دیباچہ میں ۵۵۱ھ مذکور ہے، اس لیے تالیف چہار مقالہ کی ابتدائی حد سنہ ۵۵۱ ہوتی ہے،

مقامات حمیدی کا سال تصنیف

مگر اس ابتدائی حد کے تعین میں چند دقتیں ہیں:

(ا) مقامات حمیدی کے قدیم ترین نسخہ میں جو برٹش میوزیم میں موجود ہے اور چھٹی صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے، یہ تاریخ مذکور نہیں ہے، تاریخ نہ ہونا تو زیادہ تعجب کی بات نہیں ہے، مگر قزوینی جس نے اس مخطوط کا مطبوعہ نسخوں سے مقابلہ کیا تھا، لکھتا ہے کہ دونوں میں معتد بہ فرق ہے، اور اس تفاوت و اختلاف کی توجیہ صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ قاضی حمید الدین نے "مقامات حمیدی" کے ایک سے زیادہ نسخے لکھے تھے، پہلا ۵۴۷ھ سے پہلے اور دوسرا ۵۵۱ھ میں جو پہلے کی اصلاح ہے، اب برٹش میوزیم کا محولہ بالا مخطوطہ پہلے نسخہ ہی کی نقل ہے، نیز احتمال غالب یہی ہے کہ نظامی عروضی کے پیش نظر مقامات کا نسخہ قدیم تھا، یہ فرض کرنا غیر مناسب ہے کہ پہلے نسخہ میں مصنف نے تاریخ تصنیف ۵۵۱ھ دی ہو اور برٹش میوزیم والا نسخہ اس کی نظر ثانی ہو، کیونکہ نظر ثانی میں تاریخ کا نظر انداز کر دینا ناقابل فہم ہے۔

(ب) اس سے زیادہ جو بات اس مفروضہ کی تنقیص کرتی ہے یہ ہے کہ نظامی عروضی نے

چہار مقالہ ۵۵۲ھ سے پہلے تصنیف کیا تھا، (تفصیل آگے آرہی ہے) اس لیے اگر مقامات حمیدی پہلی مرتبہ جمادی الاول ۵۵۱ھ کے بعد تصنیف ہوئی، تو چند مہینوں میں اس کتاب کا اس درجہ شہرت عام و قبول بین الانام حاصل کر لینا مستبعد معلوم ہوتا ہے کہ ایک معاصر مقامات بدیع و مقامات حریری کے دوش بدوش اس کے مطالعہ کی سفارش کرے،

(ج) غالباً قاضی حمید الدین نے مقامات حمیدی کے تین نسخے مرتب کیے تھے، تیسرا نسخہ ۵۵۵ھ کے بعد مرتب کیا، اور یہ وہی نسخہ ہے جو مطبوعہ اڈیشنوں کی بنیاد ہے، کیونکہ مطبوعہ نسخوں کے بیسویں مقامہ میں مصنف نے خلفاء کے نام عربی اور فارسی دونوں میں نظم کیے ہیں، ان میں آخری خلیفہ مستنجد باللہ ہے، چنانچہ عربی قصیدے میں لکھتے ہیں ؎

وھا مستنجد الحر الکریم ختامھم   امام الانام الیوم یظھر مفتخر

اسی طرح فارسی قصیدے میں کہتے ہیں ؎

وز بعد او گرفت بمستنجد آں سریر   وامروز ہست عالم ازو پرجمال و فر

اور مستنجد باللہ ۲ ربیع الاول ۵۵۵ھ کو تخت خلافت پر بیٹھا تھا، اس لیے مطبوعہ اڈیشن والا نسخہ ۵۵۵ھ کے بعد کا ہے، حالانکہ کتاب ۵۵۲ھ سے کہیں پہلے (غالباً ۵۳۶ھ کے کچھ بعد) تصنیف ہو چکی تھی، اس لیے مقامات کے متعدد نسخے مرتب ہوئے ہونگے، پہلا ۵۳۶ھ کے کچھ بعد، دوسرا جمادی الآخر ۵۵۱ھ میں اور تیسرا ۵۵۵ھ کے بعد۔

میرے اس خیال کی وجہ کہ مقامات حمیدی کا پہلا نسخہ ۵۳۶ھ کے قریب مرتب ہوا تھا، یہ ہے کہ اس کتاب کا تیسرا مقامہ "غزو جہاد" پر ہے "المقامۃ الثالثۃ فی الغزو والجہاد"۔ اس میں جہاد میں جانے والے غازی کی تیاری اس تفصیل سے دی گئی ہے گویا کسی نے اس واقعہ کا آنکھوں دیکھا حال ابھی ابھی مصنف کو بتایا ہے، تاریخ کے تفحص سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں دو واقعے بڑے معرکے کے

ہوئے تھے، ایک واقعہ سلطان سنجر کو گورخاں والی چین کے ساتھ پیش آیا تھا، دوسرا غزوں کے ساتھ، غز مسلمان تھے، اس لیے جو لڑائی ان کے ساتھ ہوئی تھی، اسے "غزو وجہاد" سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، البتہ گورخاں والی چین اور اس کی فوج غیر مسلم تھے [بقول ابن خلدون: "وھو مانوی المذھب"] غرض ۵۳۶ھ میں دونوں فوجوں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی اور یہ کفر و اسلام کی جنگ تھی، خود مقامات حمیدی میں ہے: "و پردہ ظلام میان کفر و اسلام حائل آمد"۔

اگرچہ اس جنگ میں مسلمانوں کو شکست فاش ہوئی مگر سیستان کی فوج نے ڈٹ کر مقابلہ کیا روضۃ الصفا میں ہے :-

وچون سلطان روئے بہزیمت نہاد تاج الدین ابو الفضل ملک نیمروز در قلب لشکر بجائے سلطان بایستاد و جنگہائے مردانہ کرد بمرتبہ کہ مخالفان از وفور جلادت او متعجب گشتند"۔

اسی سجستان کی فوج میں وہ راوی تھا جس سے قاضی حمید الدین نے مقامات میں یہ روایت کی ہے: "عزم غزو درست کردم و از ہرات قصد بست نمودم"۔ کیونکہ یہی شہر بست "سجستان (نیمروز) کا دار الحکومت تھا۔

اس لیے یہ باور کرنے کے قطعی وجوہ ہیں کہ جس جہاد کی طرف اس مقامہ میں اشارہ ہے، وہ سلطان سنجر اور گورخاں خطائی کی معرکہ آرائی تھی، اور اگرچہ اس جنگ میں سنجری فوج کو شکست فاش ہوئی مگر سجستانی فوج کو جو تاج الدین ابو الفضل ملک نیمروز کے زیر قیادت لڑی تھی، باوجود ناکامی کے اس کا احساس رہا کہ انھوں نے داد مردانگی دینے میں کوئی کمی نہیں کی، اسی لیے اس مقامہ میں اگرچہ اختتام پر نہ فتح کی شادمانی کا سماں ہے، نہ شکست کی مایوسی و دل شکستگی کا، پھر بھی شروع میں اس عزم بلند اور خود اعتمادی کا اظہار ہے، جسے نیمروز (سجستان) کی فوج نے عملاً ثابت کر دکھایا،

"در رفقۂ تازیان و جماعۂ غازیان میراندم و قوارع قرآن میخواندم ...... جمجمہ مراکب

دمدمہ مواکب غازیان شنیدم و مجاہداں راہ خدارا دیدم کہ شکر می کردند و آواز اللہ اکبر

بر می آوردند"

اور چونکہ مقامہ میں جہاد میں شرکت کی تفصیلات من و عن منقول ہیں، اس لیے غالباً یہ جزئیات اصل واقعہ پر زیادہ عرصہ گزرنے سے پہلے ہی تحریر میں آگئی تھیں، اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ یہ مقامہ ۵۳۶ھ کے کچھ ہی بعد (مثلاً ۵۴۰ھ کے قریب) لکھا گیا تھا تو شاید غلط نہ ہوگا،

چہار مقالہ کا سال تصنیف اس طرح مطبوعہ ایڈیشن میں ۵۵۱ھ کا مذکور ہونا اس بات سے مانع نہیں ہے کہ چہار مقالہ اس سنہ سے پہلے (۵۴۷ھ میں) تصنیف ہو چکا تھا، کیونکہ نظامی عروضی کے پیش نظر مقامات کا وہ ایڈیشن تھا جو ۵۳۶ھ کے کچھ ہی دن بعد مرتب ہوا تھا، اور اس عرصہ میں اس نے غیر معمولی شہرت حاصل کر لی تھی،

اب سوال چہار مقالہ کے سال تصنیف کے تعین کا ہے، اس کے لیے کتاب کی داخلی شہادتوں کے ساتھ خارجی واقعات پر نظر ڈالنی ہوگی

۵۴۷ھ میں سنجر کو علاء الدین غوری سے لڑنے کے لیے جانا پڑا، جیسا کہ خود مصنف چہار مقالہ (نظامی عروضی سمرقندی) نے لکھا ہے، اس میں سنجر کو فتح اور علاء الدین غوری کو شکست ہوئی، مگر جلد ہی صلح ہو گئی، اس جنگ سے فارغ ہونے کے بعد سنجر کو غزوں کا فتنہ فرو کرنے کے لیے لشکر کشی کرنا پڑی جس میں وہ بری طرح ناکام ہوا، ابن الاثیر کہتا ہے:-

فی محرم من سنۃ ثمان و اربعین	ان کے بعد محرم ۵۴۸ھ میں سلطان سنجر پہنچا
وخمسمائۃ وصل بعدھم السلطان	غز سے مقابلہ ہوا...... سلطان سنجر کی
سنجر فالتقاہ الغز... فانھزم	فوج کو شکست ہوئی اور وہ صفر سنہ
عسکر سنجر و مضی منھزماً فی ← [illegible]	مذکور میں پسپا ہو کر لوٹ گئی،

انجام کار اپنے حرم کے ساتھ غزوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا، بیوی کی رسوائی کی وجہ سے فرار ہونے کی کوشش بھی نہ کر سکا، آخر کار ۵۵۱ھ میں بیوی کا انتقال ہو گیا، اور سلطان کسی طرح اس قید سے فرار ہو کر مرو پہنچا، یہاں خزانہ خالی اور عام بدحالی پائی، اس سے دل ٹوٹ گیا اور ربیع الاول ۵۵۲ھ کو انتقال کر گیا، روضۃ الصفا میں ہے:-

"سلطان قریب چہار سال درمیان ایشان گرفتار بود و از بیم آنکہ حرمش ترکان خاتون در بیت مخالفان ماند تدبیر استخلاص نمی کرد، چوں در سنہ احد و خمسین و خمسمائۃ حرم محترم سلطان وفات یافت سلطان اندیشۂ مخلص نمودہ .... از آب (جیحون) عبور نمودہ ..... آنگاہ روے بدار الملک خود نہاد و چوں بمرو رسید خزانہ تہی و ولایت خراب و رعیت منتشر یافت غم اندوہ بر مزاج شریفش استیلاء پذیرفت .... از دار غرور بسراے سرور انتقال فرمود" (جلد چہارم صفحہ ۱۱۳)

نظامی عروضی اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں کرتا، اس ترک ذکر سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ تحریر میں اس کا کوئی محل نہ تھا، لیکن جس طرح وہ اسے دعائیں دیتا ہے کہ "اطال اللہ بقاءہ وادامہ الی المعالی ارتقاءہ" یا "خلد اللہ ملکھا" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس زمانہ کی دعائیں نہیں ہیں جب شوکت سنجری غزوں کی شورش سے پامال ہو چکی تھی، کیونکہ ایک قیدی بادشاہ کے لیے یہ دعائیں تضحیک سے کم نہیں، خصوصاً جب کہ اس کے ساتھ اس کی رہائی کی دعا بھی نہ ہو، اس لیے یہ عالم شوکت سنجری کا غزوں کی بغاوت سے پہلے ہی کا معلوم ہوتا ہے۔

اس لیے چہار مقالہ کی تالیف غزوں کی بغاوت سے پہلے ہی ہو چکی تھی، (جو محرم ۵۴۸ھ سے شروع ہوئی) یعنی ۵۴۷ھ میں، اس خیال کی تقویت اس بات سے ہوتی ہے کہ مقالہ سوم اور مقالہ چہارم کی آخری حکایتیں سنجر اور علاء الدین غوری کی جنگ، واقع ۵۴۷ھ سے متعلق ہیں،

اور دونوں حکایتوں میں واقعہ کی تفصیل اس انداز سے لکھی ہے کہ گویا اس کی یاد ابھی ذہن میں تازہ ہے، اس جنگ میں علاء الدین اور اس کا بھتیجا محمد بن مسعود گرفتار ہوئے، شہزادہ محمد بن مسعود کی رہائی فدیہ پر مشروط ٹھہری مگر روپیہ آنے میں تاخیر ہوئی، نظامی عروضی نے پیشین گوئی کی جو صحیح نکلی، روپیہ مقرر وقت کے اندر آگیا، ادائیگی فدیہ کے بعد شہزادہ وطن آگیا، نظامی عروضی نے جس انداز میں اس واقعہ کی تفصیل لکھی ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابھی کل ہی کا واقعہ ہے:-

"دیگر روز خداوندزادہ شمس الدولہ والدین خلعت سلطان عالم بپوشید و مطلق شد و بزدِ زین
جائے بمقر عز خویش بنہاد ہر روز کار ہا بر زیادت است و بر زیادت باد۔"

دوسری جگہ لکھتا ہے کہ شہزادے نے اسے اس صحیح پیشین گوئی اور خوشخبری کا وطن پہنچکر انعام دیا، مگر یہ انعام دینے کا واقعہ ماضی قریب ہی میں پیش آیا، لکھتا ہے:-

"و درین شبہا بود کہ بندہ را بنواخت و گفت نظامی یادداری کہ ہری آں حکم کردی و چناں راست باز آمد خواستم کہ دہان تو پر زر کنم آنجا زر نداشتم اینجا زر دوانم، زر بخواست و دہان من دو بار پر زر کرد ۔۔۔۔۔۔ ایزد تبارک و تعالیٰ ہر روز این دولت را زیادت کناد۔"

تتمہ صوان الحکمۃ کا سال تصنیف | ڈاکٹر کلیم اللہ صاحب حسینی نے "تتمہ صوان الحکمۃ" کا سال تصنیف ۵۴۹ھ بتایا ہے، مگر اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل نہیں دی، البتہ حال ہی میں "ہماری زبان" (مورخہ ۲۲ جولائی ۱۹۶۱ء) میں انھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں دو دلیلیں دی ہیں:

(۱) میں نے "ہماری زبان" (مورخہ یکم مئی ۱۹۶۱ء) میں لکھا تھا:-

"سال گذشتہ قاری سید کلیم اللہ حسینی نے اسلامک کلچر حیدرآباد میں دعویٰ کیا تھا، کہ جمار مقالہ سے بھی قدیم تر بیہقی کا تتمہ صوان الحکمۃ ہے، جو ان کے خیال میں ۵۴۹ھ کی

تصنیف ہے، حالانکہ خود کتاب کی داخلی شہادت کی رو سے ۵۵۳ھ سے بعد کی تصنیف ہے، اور اس طرح جہار مقالہ سے موخر ہے (اگرچہ خیال یہ ہے کہ ۵۶۰ھ کے بعد کی تصنیف ہے)۔"

اس پر جناب ڈاکٹر کلیم اللہ صاحب نے "ہماری زبان" (۲۲ جولائی ۱۹۶۱ء) میں تحریر فرمایا:-

"مراسلہ نگار صاحب نے تتمہ صوان الحکمۃ کی تصنیف کا سنہ نہ صرف ۵۵۳ھ تسلیم کیا ہے، بلکہ ان کے خیال میں وہ ۵۶۰ھ یا اس کے بعد کی تصنیف ہے، معلوم نہیں ان کا یہ خیال کس مواد پر مبنی ہے، ہم نے تو اپنے خیالی سنہ کا ثبوت پیش کر دیا ہے۔"

یہ ثبوت جناب ڈاکٹر قاری کلیم اللہ حسینی کے لفظوں میں حسب ذیل ہے:-

"یاقوت الحموی نے معجم الادباء جلد ۵ صفحہ ۲۰۸ پر علی بن زید البیہقی کے خود نوشتہ حالات اس کی تصنیف مشارب التجارب وغرائب الغرائب سے نقل کیے ہیں، بیہقی نے اپنی ۵۴۹ھ تک تصنیف کردہ کتابوں کا اس طرح ذکر کیا ہے:-

وھا انا اذکر تصانیفی فی ھذہ المدۃ سنۃ ۵۴۹

اس سے صاف ظاہر ہے کہ بیہقی نے اپنی انھیں تصانیف کا ذکر کیا ہے جو اس سنہ تک مکمل ہو چکی تھیں، ورنہ ۵۵۳ھ یا اس کے بعد کی تصنیف کا ذکر ۵۴۹ھ میں کیسے آسکتا ہے، ہاں اس سنہ تک اس نے تاریخ بیہقی اور لباب الانساب اور دیگر کتابیں تصنیف نہیں کی تھیں، اس لیے ان کا نام اس فہرست میں درج نہیں ہے۔"

دوسری جگہ فرمایا:-

"ہمارے نزدیک تتمہ صوان الحکمۃ کا سنہ تصنیف ۵۴۹ھ ہی مسلم ہے، اگر وہ اس سنہ کے بعد کی تصنیف ہوتا تو مصنف اس سنہ میں مکمل شدہ کتابوں کی فہرست میں اس کو ہرگز شامل نہ کرتا، جیسا کہ اس نے تاریخ بیہقی اور لباب الانساب کو شامل نہیں کیا جو اس سنہ کے

بعد کی تصانیف ہیں"

محترم المقام جناب ڈاکٹر صاحب کا استدلال بظاہر بڑا متین و رصین ہے اگر بدقسمتی سے جن شواہد پر انھوں نے اس کی تعمیر فرمائی ہے ان کے نقل کرنے میں ان سے شعوری یا غیر شعوری طور پر تسامح ہو گیا ہے،

جناب ڈاکٹر صاحب یاد کرانا چاہتے ہیں کہ بیہقی نے مشارب التجارب میں تصریح کی ہو کہ ۵۴۹ھ تک کی میری تصانیف کی فہرست حسب ذیل ہے (وھا انا اذکر تصانیفی فی ھذہ المدۃ ۵۴۹ھ) حالانکہ ایسا نہیں ہے،

(ا) ایک عربی داں سمجھ سکتا ہو کہ "فی ہذہ المدۃ ۵۴۹ھ" بیہقی جیسے ادیب کی عبارت نہیں ہو سکتی۔

(ب) غیر عربی داں حضرات کی اطلاع کے لیے اس تلخ حقیقت کا اظہار بادل ناخواستہ کرنا پڑتا ہے کہ جناب ڈاکٹر قاری کلیم اللہ صاحب نے محض سخن پروری کے لیے "فی ہذہ المدۃ" کے بعد "۵۴۹ھ" کا اضافہ کر دیا ہے، جو ایک محترم المقام پروفیسر کے شایان شان نہیں ہے۔ یاقوت جس کا جناب ڈاکٹر کلیم اللہ صاحب نے حوالہ دیا ہے معجم الادباء میں لکھتا ہے:-

"وھا انا اذکر تصانیفی فی ھٰذہ المدۃ: کتاب سؤلۃ القرآن مع الاجوبۃ

مجلدۃ کتاب اعجاز القرآن ......"

معجم الادباء میں "ہذہ المدۃ" کے بعد ۵۴۹ھ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اس عبارت سے اوپر ایک جگہ ۵۴۹ھ کا ذکر ضرور آیا ہے کہ میں نیشاپور میں غرہ رجب ۵۴۹ھ تک ٹھہرا، اس کے بعد والدہ کی زیارت کے لیے سفر کیا، اور اسی سنہ میں میرے بیٹے احمد اور والدہ کا انتقال ہو گیا، میری والدہ حافظ قرآن اور وجوہ تفاسیر کی عالمہ تھیں۔

اس سلسلے میں چند امور قابل ذکر ہیں:-

(ا) بیہقی ۵۴۹ھ کے سولہ سال بعد (۵۶۵ھ) تک زندہ رہا، اس لیے ناممکن ہے کہ ایک شخص جس نے ۵۴۹ھ تک ۷۴ کتابیں لکھی ہوں، ۱۶ سال کے عرصہ میں صرف ۲ دو ہی کتابیں لکھے، اس لیے

بہت ممکن ہو کہ ۵۴۹ھ کتابت کی غلطی ہو، اور ایسے اغلاط (بلکہ اغلاط فاحشہ) کتاب میں اور بھی ہیں، مثلاً صفحہ ۲۱۰ سطر ۶ - ۷ پر مرقوم ہے:

واقمت بھا الی السابع والعشرین من	میں وہاں، ۲۷ جمادی الاولی ۵۲۶ھ تک
جمادی الاولی سنۃ ۵۲۶ وکنت فی تلک المدۃ	مقیم رہا اور اسی مدت میں حساب، جبر و مقابلہ
انظر فی الحساب والجبر والمقابلۃ طرفا من الاحکام	اور کچھ احکام پر غور و فکر کرتا رہا،

حالانکہ بیہقی نے ۵۶۵ھ میں وفات پائی ہو، اسکے بعد ۵۶۷ھ کا مذکور یقیناً کتابت کی غلطی اور ۵۲۶ھ کی تصحیف ہے، اس لیے ممکن ہے اصل مشارب التجارب یا معجم الادباء میں کوئی بعد کا سنہ ہو گا جو کاتبوں کی تحریف و تصحیف سے ۵۴۹ھ ہو گیا جس طرح انھوں نے ۵۲۶ھ کو ۵۶۷ھ کر دیا۔

(ب) یہ ۵۴۹ھ ہو یا اس کے بعد کا کوئی سنہ مشارب التجارب بالخصوص اس کا یہ حصہ جو بیہقی کی سوانح حیات اور اس کی فہرستِ تصانیف پر مشتمل ہے ۵۴۹ھ کی تصنیف معلوم نہیں ہوتا، ماں اور بیٹے کی وفات کے دہرے غم کے بعد طبیعت میں اس نشاط و سکون کا رہنا غیر فطری ہے جو تصنیف و تالیف کی شرط اولین ہے۔

غالباً بیہقی نے اس حادثہ فاجعہ کے عرصہ بعد مشارب التجارب لکھی، اس میں اپنی زندگی کے حالات بھی لکھے، اور جب ماں اور بیٹے کی وفات کا واقعہ قلمبند کرنے لگا تو غم والم کے پرانے زخم ہرے ہو گئے، اس کے بعد اس نے کوئی واقعہ نہیں لکھا، اور قصہ مختصر کرنے کے لیے تصانیف کی فہرست دیدی "وھا انا اذکر تصانیفی فی ھٰذہ المدۃ"۔ اس رنج والم ہی کا اثر تھا کہ فہرست تصانیف میں کوئی ترتیب ملحوظ نہیں رکھی، نہ فن وار نہ سنہ وار۔

اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ تتمہ صوان الحکمہ[1] میں نہ صرف یہ کہ ۵۵۳ھ کا مذکور ہے، بلکہ کتاب کی داخلی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۶۰ھ کے بعد تصنیف کی گئی تھی۔ (تفصیل آگے آرہی ہے)

(باقی)

---

[1] اسی طرح بہاء الدین ابو محمد الخرقی تتمہ صوان الحکمہ کی تالیف سے قبل وفات پا چکا تھا، چنانچہ بیہقی اس کا ذکر بصیغہ ماضی کرتا ہے "کان من حکماء مرو"۔ بیہقی نے اس کا سال وفات نہیں دیا مگر سبکی نے طبقات الشافعیہ جلد رابع ص ۲۴۲ پر اس کا سال وفات ۵۵۳ھ بتایا ہے، لہٰذا تتمہ صوان الحکمہ ۵۵۳ھ کے بعد کی تصنیف ہے۔

قرونِ وسطیٰ کا ایک عظیم مورخ

المسعودی

از جناب مولوی شبیر عطا صاحب ندوی

نام و نسب علی نام، ابو الحسن کنیت اور قطب الدین لقب ہے، سلسلۂ نسب یہ ہے: علی بن الحسین بن علی بن عتبہ،

المسعودی کا سلسلۂ نسب حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ پر منتہی ہوتا ہے، اس نسبت سے ان کو المسعودی کہتے ہیں۔[1]

وطن المسعودی کا خاندان بابل میں بود و باش رکھتا تھا، اسی سرزمین میں المسعودی ولادت ہوئی، علامہ ابن ندیم نے الفہرست میں مسعودی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ افریقہ کا رہنے والا تھا،[2] لیکن یہ صحیح نہیں ہے، ابن ندیم کی اس غلطی کا انکشاف یاقوت نے معجم الادباء میں کیا ہے، یاقوت نے خود مسعودی کی کتابوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ مسعودی بابل میں پیدا ہوا، اور بغداد میں سکونت اختیار کی، افریقہ یا اسپین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے،[3] البتہ وہ مصر و شام میں مدتوں قیام پذیر رہا، المسعودی نے خود بھی اس کی تصریح کی ہے کہ اقلیم بابل ہی اس کا مسکن آبائی ہے۔ مروج الذہب میں یہ الفاظ

---

[1] فوات الوفیات ج ۲ ص ۴۵ و النجوم الزاہرہ ج ۳ ص ۳۱۰ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۳۰۷ و معجم الادباء ج ۵ ص ۱۴۸

[2] الفہرست مطبوعہ مصر ج ۱ ص ۲۱۹ [3] معجم الادباء ج ۵ ص ۱۴۸

اس کے قلم سے نکلے ہیں: ”واوسط الاقالیم اقلیم بابل الذی مولدنا بہ وان کانت ریب الایام انأت بیننا و بینہ۔“[1]

بغداد میں سکونت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسعودی کا خاندان بابل ہی میں رہ گیا، مگر اس نے خود بغداد کا رخ کیا، دورِ حاضر کے مشہور محقق کرد علی کی بھی یہی رائے ہے کہ مسعودی نے بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی،[2] عام مورخین مسعودی کو بغدادی الاصل کہتے ہیں،[3] ان دونوں رایوں میں تطبیق یوں دی جا سکتی ہے کہ المسعودی بابل میں پیدا ہوا اور بغداد میں اس کی تعلیم و تربیت ہوئی،

اساتذہ مسعودی کے اساتذہ میں مشہور ادیب اور مورخ نفطویہ زیادہ مشہور ہے۔

ابراہیم نام،[4] ابو عبد اللہ کنیت اور نفطویہ لقب ہے،[5] عہد اموی کے مشہور فوجی افسر مہلب ابن ابی صفرہ سے اس کا سلسلۂ نسب ملتا ہے،[6] ابن خلکان نفطویہ کے متعلق لکھتے ہیں:[7] ”کان عالماً بارعاً لہ التصانیف الحسان۔“ ابن عماد لکھتے ہیں ”کان کثیر العلم واسع الروایۃ صاحب فنون۔“[8] المسعودی کا بیان ہے۔

کان احسن اھل عصرہ تالیفاً	نفطویہ بحیثیت مصنف کے اپنے زمانہ میں ممتاز
واملحھم تصنیفاً	تھا اور اسکی تصنیفات میں بڑی دلکشی ہوتی ہے،

نفطویہ کی ولادت ۲۴۴ھ میں واسط میں ہوئی[8] لیکن اس کا مستقل قیام بغداد میں رہا، جہاں ۳۲۳ھ میں اس کا انتقال ہوا۔[9] نفطویہ نے اپنے بعد کئی کتابیں یادگار چھوڑیں، جن میں کتاب المقنع فی النحو اور غریب القرآن زیادہ مشہور ہیں،[10] نفطویہ نے تاریخ اسلام پر بھی ایک ضخیم کتاب لکھی تھی۔[11]

---

[1] مروج الذہب ج ۱ ص ۱۲۱ [2] کنوز الاجداد ص ۱۱۰ [3] فوات الوفیات ج ۲ ص ۴۵ و النجوم الزاہرہ ج ۳ ص ۳۱۰

[4] دراسیں الشیقۃ الکرام فی فنون الاسلام ص ۲۵۴ [5] لطائف المعارف مطبوعہ لیڈن ص ۵۵ [6] معجم الادباء ج ۱ ص ۳۰۷ [7] الفہرست لابن الندیم

[8] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۱۴ [8] شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۹۸ و وفیات الاعیان ج ۱ ص ۱۸ [9] معجم الادباء ج ۱ ص

[10] الفہرست ابن ندیم ص ۱۲۱ [11] معجم الادباء ج ۱ ص ۳۱۵

جس کے متعلق مسعودی کا بیان ہے کہ اپنے موضوع پر بہترین کتاب تھی، مسعودی نے اس کتاب سے بہت استفادہ کیا تھا۔

(۲) مسعودی کے اساتذہ میں دوسری شخصیت ابوخلیفہ الجمحی کی ہے، فضل بن حباب نام ابوخلیفہ کنیت اور الجمحی نسبت ہے، محدثین کے حلقہ میں ابوخلیفہ کی شخصیت کے تعارف کی ضرورت نہیں ہے[1] وہ عرصہ تک بصرہ کا قاضی رہا، ایک بار بصریوں کا ایک وفد لیکر بغداد المعتضد کے دربار میں بھی حاضر ہوا تھا، معتضد اس کی قابلیت سے بہت متاثر ہوا،

المسعودی نے بصرہ جاکر خاص طور سے ابوخلیفہ سے استفادہ کیا تھا، مشہور مورخ ابوالمحاسن جمال الدین یوسف بن تغری بردی نے النجوم الزاہرہ میں اس کی تصریح کی ہے، وہ لکھتا ہے وله رحلة الی البصرة التی فیها ابوخلیفة[2] مسعودی نے ابوخلیفہ سے متعلق بہت سے واقعات اپنی کتابوں درج کیے ہیں، ۳۰۵ھ میں ابوخلیفہ نے وفات پائی[3]،

مندرجۂ بالا اساتذہ کے علاوہ مسعودی نے بغداد کے دوسرے اہل علم سے بھی استفادہ کیا تھا، اس نے فلسفہ اور علم کلام بغداد ہی میں رہ کر سیکھا تھا، اس کو غالباً معتزلہ کے چند نامور متکلمین کی مجلسوں میں بیٹھنے کا موقع ملا ہوگا، امام ابوالقاسم محمود الکعبی البلخی، امام ابوالعباس الناشئی امام نوبختی، امام ابوعلی جبائی اس عہد کے نامور متکلمین میں تھے، مسعودی اپنی کتابوں میں اکثر کلامی بحثیں اور متکلمین معتزلہ کے اصول بیان کرتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے علم کلام سے گہری دلچسپی تھی،

المسعودی کی سیاحت | تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مسعودی نے اپنی عمر کے ۲۵ سال سیر و سیاحت

[1] معجم الادباء ج ۶ ص ۱۳۰ و بغیۃ الوعاۃ ص ۳۷۳ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۴۶
[2] النجوم الزاہرہ ج ۳ ص ۳۱۶ [3] تاسیس الشیعۃ الکرام فی فنون الاسلام ص ۲۰۴ مطبوعہ عراق

میں بسر کیے، اس نے بغداد سے سفر شروع اور عراق، شام، آرمینیا، روم، افریقہ، سوڈان کے علاوہ چین، تبت، ہندوستان اور سرندیپ کی سیاحت کی[1]،

مسعودی ہندوستان میں | المسعودی ہندوستان سے بہت اچھے تاثرات لیکر گیا، اس نے ہندوستان کی قدیم رسموں کا غائر نظر سے مطالعہ کیا، البیرونی سے بہت پہلے اس نے ہندوستان کے مذاہب کی تحقیق کی تھی، شطرنج کو وہ ہندوستان کی ایجاد بتاتا ہے، یہاں کے نادر جانوروں کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کرتا ہے، ہندوستان کے مشہور پرند طاؤس کی بڑی تعریف کی ہے[2]، اسی طرح گینڈے وغیرہ کا تذکرہ دلچسپ انداز میں کرتا ہے[3]،

مسعودی نے ہندوستان کے شمالی صوبوں میں سندھ اور پنجاب کو دیکھا تھا جنوب میں وہ کھمبائت تک گیا تھا، وہ پنجاب کے دریاؤں کا تذکرہ کرتا ہے، گنگا کا ذکر بھی کئی جگہ کیا ہے، ہمالیہ کے متعلق لکھتا ہے کہ تبت کے پہاڑوں سے زیادہ بلند پہاڑ نہیں دیکھے، بقول علامہ سید سلیمان ندوی ظاہر ہے اس سے مراد ہمالیہ ہی ہے، اس نے لکھا ہے، ہند میں بہت سی زبانیں رائج ہیں، مسلمانوں کی نوآبادیاں اس کے ہندوستان آنے سے بہت پہلے قائم ہو چکی تھیں، وہ لکھتا ہے، ہندو راجہ مسلمانوں کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں، ان کی مسجدیں بھی موجود ہیں[4]، پان اور چھالیہ کے ذکر میں لکھتا ہے کہ اب یمن وغیرہ میں بھی اس کا استعمال ہونے لگا ہے[5]،

اس نے ستی وغیرہ رسموں کا بھی معاینہ کیا تھا، چنانچہ بڑی حیرت سے لکھتا ہے:

وللهند اخبار عجيبة تجمع	ہندوستان کے عجیب غریب واقعات ہیں
من سماعها النفوس والنواع من	جن کو سنکر دل بےچین ہو جاتا ہے، اور انواع
الآلام نالم عند ذكرها	واقسام کے آلام ہیں جن کے ذکر سے تکلیف

[1] الاکتفاء القنوع ص ۵۶ و فجر الاسلام ج ۱ ص ۱۶۷ [2] مروج الذہب ج ۲ ص ۴۸۳
[3] ایضاً ج ۱ ص ۳۸۸ [4] ایضاً ج ۱ ص ۳۸۳ [5] ایضاً ج ۲ ص ۴۸

الاً بان ان دتقشعر منهنا الابشار الخ[1] ہوتی ہے اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں:

المسعودی کی سیاحت کا مقصد

مسعودی نے محض تفریحاً سیاحت نہیں کی تھی، بلکہ اس کا مطمحِ نظر ہر ملک کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا اور اس کی تاریخ سے صحیح واقفیت پیدا کرنا تھا، وہ جہاں بھی گیا یہ مقصد اس کے پیش نظر رہا۔ اس دور کے نامور مورخ ڈاکٹر احمد امین مسعودی کے متعلق لکھتے ہیں:[2]

ولم تكن اسفاره للنزهة بل كانت لمعرفة الاقطار واخبارها

مسعودی نے اپنی عمر کے آخری دس سال مصر میں گذارے اور وہیں اپنی شہرۂ آفاق کتاب مروج الذہب و معادن الجواہر لکھی۔

المسعودی کی تصنیفات

تصانیف کے لحاظ سے المسعودی اپنے عہد کا سب سے بڑا مصنف و اہل قلم ہے، اس کی کتابیں مختلف علوم و فنون پر تھیں، افسوس ہے کہ اس کی بہترین تصنیفات دستبردِ زمانہ کی نذر ہو گئیں،[3] آج بہتوں کے نام بھی نہیں معلوم ہو سکتے، لیکن خوش قسمتی سے مروج الذہب اور التنبیہ والاشراف میں جابجا مسعودی نے اپنی جن کتابوں کا تذکرہ کیا ہے، اس کی روشنی میں ایک فہرست مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۱) اخبار الزمان۔ جس کا پورا نام اخبار الزمان ومن اباده الحدثان من الامم الماضیہ والاجیال الخالیہ والملوک الدائرہ۔[4] مسعودی کو اپنی اس تالیف پر بڑا ناز تھا، مروج الذہب میں تقریباً ۳۰ بار اس نے اس کا ذکر کیا ہے، حاجی خلیفہ نے بھی کشف الظنون میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے،[5] وہ لکھتا ہے کہ اس کتاب کے تیس اجزاء ہیں، اور ہر جزء ایک فن پر مشتمل ہے، مروج الذہب کے مقدمہ میں مسعودی نے اخبار الزمان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے: میں نے اخبار الزمان کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو مندرجہ ذیل

[1] مروج الذہب ج ۲ ص ۴۰، [2] ظہر الاسلام ج ۲ ص ۳۰۷، [3] ایضاً ص ۳۰۷، [4] ابن ندیم نے اخبار الزمان کا تذکرہ نہیں کیا ہے [5] کشف الظنون ج ۱ ص ۱۶ و مروج الذہب ج ۱ ص ۳۰۶ مطبوعہ پیرس [6] مروج الذہب ج ۱ ص ۲

مباحث پر مشتمل ہے: زمین کی شکل، دنیا کے چند بڑے شہر، عجائباتِ عالم، سمندروں کے حالات، دنیا کی جھیلیں، دنیا کے مشہور پہاڑ، دنیا کے چند بڑے دریا، زمین کی کانیں، سمندروں کی گہرائیاں، جزیروں کے حالات، قدیم عمارتیں، مسمار شدہ شہر، داستانِ آفرینش، نسل انسانی کی ابتدا، جغرافیائی تغیرات اور ان کے طبعی اسباب، اقالیم عالم کے خواص، تاریخ عہد قدیم کے متعلق مختلف اقوال، اس بارہ میں شریعت کا فیصلہ، قدیم فرماں روایانِ عالم کی تاریخ، گذشتہ قوموں اور قرونِ مظلمہ کی تحقیق، فراعنۂ مصر نیز اکاسرۂ فارس اور قیاصرۂ روم کے حالات، قدیم فلاسفہ، حکماء نیز انبیاء کے قصے، بعثت نبوی کا بیان، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاء راشدین، امویین و عباسیین کی تاریخ، فاطمیوں کا دعویٰ، خلافت اور اس سلسلہ میں عباسیوں سے ان کے اختلافات وغیرہ ..... "

مندرجۂ بالا عنوانات پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کس قدر جامع اور ضخیم تاریخ تھی، مسعودی نے اس کی تالیف کا کام ۳۳۲ھ میں ختم کیا، علمی دنیا کے لیے یہ ایک المیہ ہے کہ اخبار الزمان دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور کسی کتبخانہ میں اس کا سراغ نہیں ملتا۔

اخبار الزمان کا مطبوعہ نسخہ اور اس کی تاریخی حیثیت

اخبار الزمان کے نام سے ایک کتاب ۱۹۳۸ء میں مصر سے شائع ہوئی تھی، یہ مطبوعہ نسخہ اخبار الزمان کے اس قلمی نسخہ کی نقل ہے جو پیرس کی پبلک لائبریری میں موجود ہے، اور جس کا عکسی نسخہ مصر کے شاہی کتبخانہ میں محفوظ ہے، پیرس کا یہ نسخہ نویں صدی ہجری کا مخطوطہ ہے،[2]

مندرجۂ ذیل دلائل کی بنا پر اخبار الزمان کا یہ مطبوعہ نسخہ اس اخبار الزمان سے بالکل مختلف ہے جس کا تذکرہ مسعودی نے بار بار کیا ہے۔

(۱) جیسا کہ خود مسعودی نے بیان کیا ہے اور صاحب کشف الظنون نے بھی اس کی تائید کی ہے کہ

[1] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جرجی زیدان ج ۲ ص ۳۱۲ [2] تذکرۃ النوادر ص ۱۰۷

اخبار الزمان ایک بڑی ضخیم تاریخ تھی، جو ہزاروں صفحات پر مشتمل تھی، اس کا خلاصہ الاوسط کے نام سے پھر اسی الاوسط کا خلاصہ مروج الذہب کے نام سے کیا گیا تھا[1]، مروج الذہب کی موجودہ ضخامت پندرہ سو صفحات ہے، اسی تناسب سے الاوسط کی ضخامت تین ہزار اور اخبار الزمان کی چھ ہزار ہونا چاہیے، لیکن مطبوعہ نسخہ صرف دو سو باون صفحات پر مشتمل ہے[2]،

(۲) مروج الذہب میں اخبار الزمان کے جو حوالے ہیں وہ موجودہ مطبوعہ نسخہ میں نہیں ملتے[3]

(۳) مسعودی نے اخبار الزمان کا نام مروج الذہب کے مقدمہ میں یہ درج کیا ہے،

"اخبار الزمان ومن اباده الحدثان من الامم الماضیه والاجیال الخالیة والملوک الدائرة" اور مطبوعہ نسخہ میں یہ نام اس طرح ہے "اخبار الزمان ومن اباده الحدثان وعجائب البلدان والغامر بالماء والعمران۔

مندرجۂ بالا دلیلوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مطبوعہ نسخہ اخبار الزمان نہیں ہے، بلکہ اس کا خلاصہ ہے لیکن خلاصہ بھی نامکمل، یہ خلاصہ کس نے کیا، خود مسعودی نے کیا یا کسی اور نے، اس کے بارہ میں شاید آیندہ کوئی تاریخی انکشاف ہو سکے، اخبار الزمان مطبوعہ مصر کے مصحح عبد اللہ الصاوی کا بیان ہے کہ ایک مستشرق کو اخبار الزمان کے بارہ میں معلوم ہوا کہ وہ قسطنطنیہ میں ہے، اس نے بڑے اشتیاق سے وہاں کا سفر کیا، لیکن وہاں کے شیوخ نے اسے نسخہ کے زیارت کرنے کی بھی اجازت نہیں دی، مستشرق مذکور نے ہر ممکن طریقہ سے اسے حاصل کرنے کی کوشش کی، اور اس کوشش میں اسے اپنی جان تک سے ہاتھ دھونا پڑا، اور وہ نسخہ پھر ایک عرصہ کے لیے مفقود ہو گیا[4]، مگر یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اخبار الزمان دنیا سے نابید نہیں ہو گئی، دسویں صدی کے مشہور ترکی مورخ طاش کبری زادہ کے ایک بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے ترکی کے کسی کتبخانہ میں اسکا کوئی نسخہ دیکھا تھا جو بعد کو نہ مل سکا۔ ویانا میں بھی اخبار الزمان کا ایک ٹکڑا موجود ہے[5]۔

---

[1] مروج الذہب ج ۱ ص ۴ و کشف الظنون ج ۱ ص ۹۱ [2] یہ نسخہ مطبع عبد الحمید احمد حنفی مصر سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا [3] مقدمہ ناشر اخبار الزمان ص د [4] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جورجی زیدان ج ۲ ص ۳۱۲

(۲) الاوسط۔ اسے اخبار الزمان کا خلاصہ کہنا چاہیے، حاجی خلیفہ کی یہی رائے ہے[1]، مسعودی نے اس کتاب کا تذکرہ مروج الذہب میں بار بار کیا ہے، الاوسط میں بعض مباحث کا اضافہ کیا گیا ہے جو اخبار الزمان میں نہیں تھے، مثلاً محدثین کا تذکرہ اخبار الزمان میں نہیں تھا، الاوسط میں بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے،

مسعودی کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی ناپید ہو گئی، آکسفورڈ یونیورسٹی لائبریری میں ایک قدیم لامعلوم الاسم نسخہ کے بارے میں مستشرقین کا خیال ہے کہ غالباً یہ الاوسط ہے، دمشق کے کتبخانوں میں بھی الاوسط کے کچھ حصے پائے جاتے ہیں[2]،

(۳) مروج الذہب و معادن الجوہر۔ المسعودی کی خواہش تھی کہ ایک ایسی جامع تاریخ مرتب کی جائے جو تاریخ عام نیز تاریخ اسلام کے ہر پہلو پر حاوی ہو، اس لیے اس نے اخبار الزمان اور الاوسط کے اہم تاریخی مباحث اور اپنی دوسری علمی و ادبی تصنیفات کے جستہ جستہ حصے لیکر ایک نئی کتاب مروج الذہب کی شکل میں مرتب کی[3]، گو مصنف کو اس کا اعتراف ہے کہ مروج الذہب میں بعض خامیاں ہیں لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ اس کو سکون کے ساتھ کبھی بیٹھنا نصیب نہیں ہوا، کیونکہ اس نے عمر کا زیادہ حصہ سیاحت میں بسر کیا[4]، مروج الذہب کی خصوصیات مندرجۂ ذیل ہیں،

(۱) مروج الذہب اگرچہ اسلام کی تاریخ ہے مگر اس کے مقدمہ میں تمام مہذب قوموں کی تاریخ اجمالاً بیان کی گئی ہے[5]، (۲) صاف اور سادہ واقعہ نگاری کا بہت عمدہ نمونہ ہے،

(۳) ادبی حیثیت سے بھی ممتاز ہے، اس کے چھوٹے چھوٹے ادبی فقرے، سادہ اور بے تکلف روزمرہ کے الفاظ کا استعمال اور طرز ادا کی بے ساختگی قابل تعریف ہے، (۴) مروج الذہب،

---

[1] کشف الظنون ج ۱ ص ۱۰۱ [2] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جورجی زیدان ج ۲ ص ۳۱۲ [3] مروج الذہب ج ۱ ص ۷ ج ۴ ص ۱۱۳ [4] ایضاً ج ۱ ص ۵ [5] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جورجی زیدان ج ۲ ص ۳۱۲

مسعودی کی تمام تاریخی تصنیفات کا نچوڑ ہے،[1] (۵) مروج الذہب میں مسعودی نے دوسرے علمی مباحث پر بھی بڑی تفصیلی روشنی ڈالی ہے، معتزلہ وغیرہ کے بارے میں اس نے چند اہم انکشافات کیے ہیں،[2]

(۶) مروج الذہب میں مسعودی نے اپنا رویہ بہت ہی محتاط رکھا ہے، وہ لکھتا ہے:

ولیعلم من نظر فیہ انی لم انتصر	جو شخص اس کتاب کو پڑھے گا اسکو اندازہ ہو جائیگا
لمذھب ولا تحیزت الی قول	کہ میں نے کسی مسلک مذہب کی حمایت نہیں کی ہے
ولا حکیت عن الناس الا محاسن	اور نہ ان میں سے کسی کا قول اختیار کیا ہے اور صرف
اخبارھم[3]	قوموں کے محاسن اور ان کی اچھی چیزیں بیان کی ہیں،

(۷) مسعودی کو خود یہ کتاب بہت پسند تھی، ایک جگہ لکھتا ہے کہ مروج الذہب بادشاہوں کو تحفہ میں دینے کے لائق ہے، اس نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اس کو لکھا تھا، اور اس کو یہ اندیشہ تھا کہ اس کتاب کی شاید اتنی قدر نہ ہو سکے جتنی وہ چاہتا ہے لیکن مسعودی کے اندیشہ کے برعکس اور اس کی تمنا کے مطابق اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اور ہر دور میں اس سے استفادہ کیا جاتا رہا، مروج الذہب مصر سے کئی بار شائع ہوئی،[4] فرانس میں اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا گیا، جو نو جلدوں میں ۱۸۶۲ء میں پیرس سے شائع ہوا، اسپرنگر نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا تھا جس کی پہلی جلد ۱۸۴۱ء میں لندن سے شائع ہوئی تھی، اردو میں بھی اس کا ترجمہ حیدرآباد دکن سے شائع ہو چکا ہے،[5]

(۴) التنبیہ والاشراف۔ اس کا پورا نام فنون المعارف وماجری فی الدھور السوالف الاستذکار لما مر فی سوالف الاعصار ہے، یہ کتاب مذکورہ بالا

[1] مروج الذہب ج ۱ ص ۲۲ [2] مروج الذہب ج ۱ ص ۲۰ جھ ص ۲۳ ج ۷ [3] ایضاً ج ۹ ص ۳۷

[4] معجم المطبوعات العربیہ ص ۱۷۴۳ و اکتفار القنوع ص ۵۶ [5] ادارہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

کتاب کی روشنی میں لکھی گئی ہے خصوصاً الاستذکار کے تقریباً تمام مباحث اختصار کے ساتھ اس میں آگئے ہیں، التنبیہ والاشراف کی حیثیت ایک تاریخی بیاض کی سی ہے، مسعودی کی تصنیفات کی ایک اہم خصوصیت تنوع ہے، یہ خصوصیت اس کتاب میں بہت نمایاں ہے، اس میں بعض ایسے تاریخی مباحث ہیں، جن کی نظیر دوسری کتابوں میں نہیں ملتی،[1] ضروری تاریخی یادداشتیں تقریباً سب اس میں موجود ہیں، ۱۸۹۴ء میں لیڈن سے پہلی بار شائع ہوئی،[2] اس کا فرانسیسی ترجمہ بھی ہو چکا ہے، اردو میں اسے مولانا عبداللہ عمادی نے منتقل کیا۔

(۵) **الاخبار المسعودیات**۔ اس کتاب کا تذکرہ مسعودی نے التنبیہ والاشراف میں کیا ہے،[3]

(۶) **مزاہر الاخبار وطرائف الآثار**۔ یہ اہلبیت اور شیعان علی کی تاریخ ہے۔[4]

(۷) **حدائق الاذہان فی اخبار آل محمد**۔ یہ بھی اہل بیت کی تاریخ ہے۔[5]

(۸) **کتاب البیان فی اسماء الائمہ**۔ التنبیہ والاشراف میں اس کا نام آیا ہے۔[6]

(۹) **ذخائر العلوم وما کان فی سالف الدہور**۔ یہ بڑی اہم کتاب ہے، ابن ندیم نے اخبار الزمان کے بجائے اسی کا تذکرہ کیا ہے، مسعودی نے التنبیہ والاشراف میں اس کے حوالے دیے ہیں، کشف الظنون میں بھی اس کا نام آیا ہے۔[7]

(۱۰) **کتاب الانتصار**۔[8] یہ خوارج کی تاریخ ہے۔

(۱۱) **کتاب مقاتل فرسان العجم**۔[9] التنبیہ والاشراف میں اس کا ذکر آیا ہے۔

[1] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جورجی زیدان ج ۲ ص ۳۱۵ [2] معجم المطبوعات العربیہ ص ۱۷۴۴

[3] التنبیہ والاشراف ص ۳۳۳ [4] مروج الذہب ج ۴ ص ۳۶، [5] ایضاً ج ۳ ص ۱۶۱ و کشف الظنون ج ۱ ص ۴۲۰

[6] التنبیہ والاشراف ص ۲۹۰ [7] الفہرست ص ۲۱۹ و کشف الظنون ج ۱ ص ۵۲۷ [8] مروج الذہب ج ۳ ص ۱۴۴

[9] التنبیہ والاشراف ص ۱۰۲ و کشف الظنون ج ۱ ص ۶۰

(۱۲) راحۃ الارواح - اس میں شاہان عالم کے حالات، اور ان کی کشور کشائیوں پر تفصیلی تبصرہ تھا۔[1]

(۱۳) کتاب تقلب الدول وتغیر الآراء والملل - } التنبیہ والاشراف میں ان
(۱۴) کتاب نظم الجواہر فی تدبیر الممالک - } دونوں کا تذکرہ موجود ہے۔[2]

(۱۵) کتاب القضایا والتجارب[3] - میرا خیال ہے المسعودی نے اپنا سفرنامہ بھی مرتب کیا ہوگا، خود مسعودی کے بیان سے اس کی تائید ہوتی ہے، وہ لکھتا ہے:-

وقد اتینا علی سائر	میں نے روئے زمین اور مختلف
ماشاھدناہ حسانی	ملکوں کی سیاحت میں جو کچھ مشاہدہ
مطافاتنا الارض والممالک	کیا اور حیوانات، نباتات اور جمادات
ومانمی الینا من خبر	کے خواص اور طبعی اسرار معلوم ہوئے
الخواص واسرار الطبیعۃ	اور عجیب وغریب عمارتوں اور آثار کے
من الحیوان والنبات	متعلق بعض دوسروں کے جو معلومات
والجمادات وعجائب	حاصل ہوئے ان سب کو اپنی
البنیان والآثار والبقاع	کتاب کتاب القضایا والتجارب
فی کتابنا المترجم بکتاب	میں جمع کر دیا ہے۔
القضایا والتجارب[4]	

اس بنا پر القضایا والتجارب کو اگر مسعودی کا سفرنامہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا،

۱؎ کشف الظنون ج ۱ ص ۱۳۵ ۲؎ التنبیہ والاشراف ص ۳۳۴ و ص ۴۰۱ ۳؎ کشف الظنون ج ۲ ص ۲۹۵ ۴؎ مروج الذہب ج ۲ ص ۴۹

مندرجہ بالا کتابوں میں مسعودی نے زیادہ تر تاریخی اور جغرافیائی حالات بیان کیے ہیں، تاریخ وجغرافیہ کے علاوہ بھی اس نے مختلف علوم پر کتابیں لکھی ہیں، جن کی مختصر فہرست درج ذیل ہے:-

کتاب المقالات فی اصول الدیانات[1]، کتاب الابانۃ عن اصول الدیانۃ[2]، کتاب نظم الادلۃ فی اصول الملۃ[3]، کتاب الصفوۃ فی الامامۃ[4]، کتاب الاستبصار فی الامامۃ[5]، کتاب المسائل والعلل فی المذاہب والملل[6]، کتاب نظم الاعلام فی اصول الاحکام[7]، کتاب خزائن الدین وسر العالمین[8]، کتاب سر الحیات[9]، کتاب حل المجالس[10]، کتاب المبادی والتراکیب[11]، کتاب الرؤس السبعیۃ فی الاحاطۃ بسیاسۃ العالم واسرارہ[12]، کتاب الزاہی[13]، کتاب الدعاوی[14]، کتاب الاسترجاع[15]، کتاب الرؤیا والکمال[16]، کتاب الواجب فی الفروض اللوازم[17]، کتاب الزلف[18]، کتاب طب النفوس[19]، کتاب الرسائل[20]، کتاب التبیین[21]، کتاب البیان فی اسماء الائمۃ[22]۔

مسعودی کی تصنیفات کی یہ مختصر فہرست ہے، جو ابن تغری بردی، شاکر کتبی، تاج سبکی، یاقوت حموی، ابن عماد حنبلی، حاجی خلیفہ کی کتابوں کی مدد سے مرتب کی گئی ہے، مسعودی نے مروج الذہب اور التنبیہ والاشراف میں اپنی جن تصنیفات کا ذکر کیا ہے، ان کا بھی ذکر اس فہرست میں آگیا ہے،

(باقی)

۱؎ تا ۲۲؎ ان سب کتابوں کا تذکرہ مروج الذہب، التنبیہ والاشراف، کشف الظنون، النجوم الزاہرہ، فہرست ابن ندیم، لسان المیزان، معجم الادباء، طبقات الشافعیہ، فوات الوفیات وغیرہ میں ہے۔

ادبیات

حقائق و معارف

از جناب افقر موہانی وارثی

آنکھ جھپکی، ابھی کچھ نہیں ہے — ہستیِ آدمی کچھ نہیں ہے
عارضی زندگی کچھ نہیں ہے — غم ہی غم ہے خوشی کچھ نہیں ہے
طالبِ عشق ہے حسن لیکن — مقصدِ عاشقی کچھ نہیں ہے
اک فریبِ نظر ہے یہ دنیا — دہر کی دل کشی کچھ نہیں ہے
میرا سجدہ ہے اور انکی چوکھٹ — غیر کی بندگی کچھ نہیں ہے
مستیِ چشمِ ساقی سلامت — مجھکو مے کی کمی کچھ نہیں ہے
شیخ صاحب ہیں پیرِ مغاں بھی — ان کا معیار ہی کچھ نہیں ہے
حاصلِ موت بھی کچھ ہے لیکن — حاصلِ زندگی کچھ نہیں ہے
ان کا جلوہ ہے نظروں میں رقصاں — آنکھ اب دیکھتی کچھ نہیں ہے
کب ہے سجدہ میں قیدِ تعین — وقت کی بندگی کچھ نہیں ہے
دیکھ کر چشمِ ساقی کی مستی — حاجتِ میکشی کچھ نہیں ہے
ایسی دنیا کا عالم نہ پوچھو — جو ابھی ہے، ابھی کچھ نہیں ہے

آستاں ان کا چھوٹے نہ افقر
خلد کی دل کشی کچھ نہیں ہے

غزل

از جناب تسکین قریشی

جب تری رہگذر سے گذرے ہیں — ہم تو کچھ بے خبر سے گذرے ہیں
کیا یونہی مل گیا ہے منصبِ عشق — ان کی اک اک نظر سے گذرے ہیں
کتنے چہروں سے اٹھ گئی ہے نقاب — ہم جنوں میں جدھر سے گذرے ہیں
مے چھٹی اور میکدہ نہ چھٹا — جب بھی گذرے ادھر سے گذرے ہیں
خود انھیں بھی خبر نہیں جن کی — وہ بھی جلوے نظر سے گذرے ہیں

ٹھوکریں کھائی ہیں وہیں تسکیں
ہم سنبھل کر جدھر سے گذرے ہیں

غزل

از جناب اختر مسلمی اعظمی

خوشی میں بھی خوشی حاصل نہیں ہے — تمہارا غم اگر شامل نہیں ہے
نہ ہو دل میں اگر دردِ محبت — تو کوئی اور شے ہے دل نہیں ہے
محبت منزلِ انسانیت ہے — محبت کی کوئی منزل نہیں ہے
سمجھ لے آدمی مرنا جو آساں — تو جینا بھی کوئی مشکل نہیں ہے
طبیعت میں نہ ہو آساں پسندی — تو پھر مشکل کوئی مشکل نہیں ہے

جو اٹھ جاتی ہے سوئے تشنہ کاماں
تری چشمِ کرم عاقل نہیں ہے

باب التقریظ والانتقاد

رسائل و اخبارات کے خاص نمبر

ادبی دنیا - مرتبہ مولانا صلاح الدین احمد صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۲۹۶، قیمت عہ، پتہ دفتر ادبی دنیا، مال روڈ، لاہور۔

مشہور ادبی رسالہ "ادبی دنیا" نے اس مرتبہ بھی حسب معمول اپنا خاص نمبر نکالا ہے، اس کے بیشتر مضامین ادبی اور بعض علمی و سوانحی ہیں، افسانوں اور ادبیات کا بھی ایک حصہ ہے، ادبی مضامین میں "بغاوت کی ایک مثال، ن، م راشد" علمی مضامین میں "اردو کی قدیم مذہبی مثنویاں" اور سوانحی مضامین میں "سید حسین" خاص طور سے لائق ذکر ہیں، نظموں اور غزلوں کا حصہ بھی معیاری ہے، آخر میں بحث و نظر کے عنوان سے "حسن" کے متعلق چند اصحاب قلم نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے، اور "تجزیاتی مطالعہ" کے زیر عنوان ایک نظم "کتب خانے" کا چند اصحاب ذوق نے تجزیہ کیا ہے، "شام کی باتیں" کے تحت بڑی دلچسپ چیزیں دی گئی ہیں، مجموعی حیثیت سے نمبر مطالعہ کے لائق ہے، امید ہے کہ ادبی دنیا کے دوسرے خاص نمبروں کی طرح یہ نمبر بھی مقبول ہوگا۔

ادب لطیف سالنامہ - مرتبہ جناب میرزا ادیب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۲۶۰، قیمت ے، پتہ دفتر ماہنامہ ادب لطیف، ۸۸ میکلوڈ روڈ، لاہور۔

اردو کے ادبی اور ترقی پسند رسالوں میں "ادب لطیف" ایک اہم رسالہ ہے، اس کا سالنامہ بھی مختلف اصناف ادب کے مضامین کا مجموعہ ہے، مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر عبدالحق مرحوم، ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر عبادت بریلوی وغیرہ جیسے مشہور اور نقاد اہل قلم کے مضامین، افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، حیات اللہ انصاری، انور عظیم اور رام لعل وغیرہ کے افسانے ہیں، "داغ" پر سید سبط حسن کا اور "نظم اور اس کا پس منظر" کے عنوان سے ڈاکٹر وزیر آغا کا مضمون محنت اور دیدہ ریزی سے لکھے گئے ہیں، اردو کے بعض اہم شعراء کے کلام کا تنقیدی و فنی جائزہ لیا گیا ہے، نظموں اور غزلوں کا حصہ بھی مجموعی اعتبار سے بلند پایہ ہے، ترقی پسند ادب اور ادیبوں کی بعض بے اعتدالیوں اور خامیوں سے قطع نظر یہ سالنامہ مفید مضامین اور معیاری ادب کا اچھا مجموعہ ہے۔

نیرنگ خیال سالنامہ - مرتبہ حکیم محمد یوسف حسن و سید محسن ہاشمی صاحبان، متوسط سائز، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۲۸، قیمت سالانہ مع خاص نمبر مثے بغیر خاص نمبروں کے صہ، پتہ دفتر نیرنگ خیال ۹۵ فلیمنگ روڈ، لاہور۔

نیرنگ خیال اردو کا قدیم اور مشہور ادبی رسالہ ہے، اس کا یہ سالنامہ بھی سنجیدہ علمی و ادبی اور طنزیہ مضامین اور دلچسپ افسانوں پر مشتمل ہے، شروع میں فاضل مرتب کا اداریہ "ادب اور اس کی ذمہ داریاں" خاص طور سے بہت مفید اور قابل غور ہے، مضامین میں سب سے زیادہ ممتاز اور اہم ڈاکٹر سید عبداللہ کا وہ خطبۂ صدارت ہے جو انجمن ادبی رسائل کے اجلاس منعقدہ ۲۸، ۲۹ جنوری ۱۹۶۲ء میں پڑھا گیا تھا، سید عابد علی عابد کا مضمون "اقبال کی اردو رباعی"، "فورٹ ولیم کالج" پر سید سبط حسن اور "آئین اسٹائن کا نظریۂ اضافت" پر مسعود بٹ کے مضامین معلومات افزا اور تلاش و محنت کا نتیجہ ہیں، مریم جمیلہ کا مضمون "کیا ہمیں بدلتے زمانوں کے ساتھ بدل جانا چاہیے" بھی مفید اور لائق مطالعہ ہے، نظموں اور غزلوں کا حصہ بھی ستھرا ہے، مجموعی حیثیت سے یہ نمبر بھی کامیاب ہے۔

شاعر جمہوریت نمبر - مرتبہ جناب اعجاز احمد صدیقی و تھمند رناتھ، متوسط سائز کاغذ معمولی، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۱۴، قیمت: عہ/ ناشر مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۵۲۲۶ بمبئی ۴ء

رسالہ شاعر اردو زبان و ادب کا پرانا خدمتگذار ہے، وہ سال میں کئی خاص نمبر شائع کرتا ہے، جمہوریۂ ہند کی بارہویں سال گرہ کے موقع پر اس نے جمہوریت نمبر نکالا ہے۔ یہ نمبر جمہوریت کے متعلق مفید مضامین، افسانوں، ڈراموں اور منظومات پر مشتمل ہے، لکھنے والوں میں بیشتر ملک کے مشاہیر اہل قلم ہیں، ہندوستان میں گذشتہ ۱۲ سال سے جمہوریت کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ اس قلیل عرصہ میں بعض اعتبار سے اس نے غیر معمولی ترقی کی ہے، لیکن ابھی جمہوریت نے صحیح اور کامل شکل اختیار نہیں کی ہے، اس لیے اس نمبر میں جمہوریت کی خوبیوں اور ہندوستان میں اسکی کامیابیوں کے ساتھ اس کی خامیوں، فروگذاشتوں اور بے انصافیوں کی جانب بھی توجہ دلائی گئی ہے، جو خاص طور سے ارباب حل و عقد کے لیے لائق غور ہے، رسالہ کے آخر میں "شاہراہ ترقی" کے عنوان سے مختلف ریاستوں اور صوبوں میں پنچ سالہ منصوبوں کے تعمیری کارناموں کا ذکر ہے، خالص ادبی و افسانوی نمبروں کے مقابلہ میں ایسے خاص نمبر زیادہ مفید ہیں،

تحریک خصوصی شمارہ - مرتبہ جناب گوپال متل وغیرہ، متوسط سائز، کاغذ، کتابت و طباعت اعلی صفحات ۱۳۰، قیمت عہ، پتہ دفتر ماہنامہ تحریک انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی۔

تحریک ابھی نو عمر رسالہ ہے، مگر اس کم عمری میں اس نے اردو کے رسالوں میں اپنی اہم جگہ بنالی ہے، اس کے کئی خاص نمبر بھی نکل چکے ہیں، اس نمبر کو چین نمبر کہنا چاہیے، اس میں موجودہ کمیونسٹ چین کے ادبی اور ثقافتی رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے، اور وہاں کے تین اہم طبقوں یعنی دانشوروں، طالب علموں اور عوام پر ماؤزے تنگ کے انقلاب کا اثر دکھایا گیا ہے، اس نمبر سے کمیونسٹ چین کے اصلی خط و خال سامنے آجاتے ہیں، ایک مضمون "چین کے دانشور"

کے سوا جو فاضل مرتب کے قلم سے ہے، باقی تین مضامین خود چین کے مشہور مصنفین کی کتابوں اور ناولوں سے لیے گئے ہیں، اس لیے ان کا بیان گھر کے بھیدی کی شہادت کی حیثیت رکھتا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سرخ انقلاب سے آزادی، آسودگی اور امن و انصاف کے بجائے غلامی، ابتری اور ظلم و تشدد چین کے حصہ میں آیا ہے، اسی لیے کبھی کبھی اہل چین کی زبان سے آہ و فغاں کی صدائیں بھی نکل جاتی ہیں، اور کچھ مظلوم و ستم رسیدہ . . . جبر و تشدد کے اس نظام کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں، مرتب نے ہر مضمون کے شروع میں اس کی مختصر وضاحت کر دی ہے، اور ہندوستان دشمن چین کی مدح سرائی پر ہندوستان کے سرخوں کی بھی خبر لی ہے، اور ان کی خوش فہمیوں کی پوری تردید کی ہے شروع میں لائق مرتب نے اس نمبر کی غرض و غایت اور چین کے انقلاب کا مختصر تذکرہ بھی کر دیا ہے، اس نمبر سے چین کے متعلق کمیونسٹ پروپگنڈے کی پوری تردید ہو جاتی ہے، اور اس کی اصل تصویر سامنے آجاتی ہے۔

جامعہ سالنامہ - مرتبہ جناب عبد اللطیف اعظمی، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۹۲، قیمت عہ، پتہ: رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی،

یادش بخیر رسالہ جامعہ تقریباً ڈیڑھ سال سے اپنی روایاتی شان سے نکلنا شروع ہوا ہے، اس نے اپنا ایک خاص نمبر نکالا ہے، جو ۱۹۶۱ء کی اردو مطبوعات کے جائزہ پر مشتمل ہے، اس میں مختلف اصناف علم و ادب کی کتابیں شامل ہیں، ڈاکٹر عبادت بریلوی نے پاکستان کی اردو مطبوعات کا جائزہ لیا ہے، بعض مضامین میں ۶۱-۱۹۶۰ء کے ادب کا جائزہ لیا گیا ہے، ایک مضمون میں ۱۹۶۱ء میں وفات پانے والے ادیبوں اور نامور لوگوں کا مختصر تذکرہ ہے، لیکن اس جائزہ میں مذہبی، علمی، تعلیمی وغیرہ بہت سے اصناف کی کتابیں چھوٹ گئی ہیں، ایک نمبر میں ان سب کا احاطہ دشوار بھی تھا جس کا اعتراف مرتب کو بھی ہے، اس نمبر کے اکثر مضامین تلاش و محنت سے لکھے گئے ہیں

اور وہ مفید ہیں، رشید حسن خاں صاحب کا مضمون "نظم (۱۹۶۶ء) میں شائع ہونے والے مجموعے" خصوصیت کے ساتھ بہت مفید اور لائق مطالعہ ہے، راجندر ناتھ شیدا، غلام احمد فرقت کاکوروی، اور خود فاضل مرتب کے مضامین بھی قابل ذکر ہیں، اس نمبر کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں بعض نامور ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف پر بڑی جرأت کے ساتھ مخلصانہ اور سنجیدہ تنقید کی گئی ہے، گو یہ نمبر اپنے مقصد کے لحاظ سے جامع نہیں ہے، پھر بھی بہت مفید اور کارآمد ہے، اگر اردو کی مطبوعات کا سال بہ سال اسی طرح تنقیدی جائزہ ہوتا رہے تو اس سے مختلف قسم کے علمی و ادبی فوائد حاصل ہوں گے،

نیا شعور ٹیگور نمبر۔ مرتبہ جناب شکیل الرحمٰن وغیرہ، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۹۴ قیمت تحریر نہیں، شائع کردہ شعبۂ اردو، جامعہ جموں و کشمیر سری نگر۔

ٹیگور کی صد سالہ یادگار کے موقع پر اردو کے بہت سے رسالوں نے ٹیگور نمبر نکالے تھے، اس سلسلہ میں "نیا شعور" نے جو جموں و کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے شائع ہوا ہے اپنا پہلا ہی نمبر ٹیگور کے نام سے نکالا ہے اس سلسلہ میں ان کے افکار و تعلیمات سے بحث کی گئی ہے، اور اس کی روشنی میں ان کی کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے پروفیسر شکیل الرحمٰن کا مضمون گو طویل لیکن مفید ہے، اداریہ میں بنگالی ادب کی مختصر تاریخ ہے، اس طرح یہ رسالہ ٹیگور کے افکار و تصورات کا بہت اچھا ترجمان ہے،

قومی زبان عبد الحق نمبر۔ مرتبہ انجمن ترقی اردو پاکستان، صفحات ۲۳۲، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، قیمت ۱۲؍، پتہ کل پاکستان انجمن ترقی اردو، اردو روڈ کراچی،

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ترجمان پندرہ روزہ قومی زبان نے جو عرصہ سے بابائے اردو مولوی عبد الحق صاحب مرحوم کی سرپرستی میں نکلتا تھا پہلے مولوی صاحب مرحوم کی وفات کے بعد ان کی یادگار میں اپنا خاص نمبر نکالا ہے، اس میں بیشتر ایسے مضامین، منظومات اور تاثرات کو جو مولوی صاحب مرحوم کی یاد میں دوسرے اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں جمع کر دیا گیا ہے، یہ مضامین زیادہ تر تعزیتی نوعیت کے ہیں، اس لیے ہلکے پھلکے اور مختصر ہیں بعض اہم بھی ہیں جن سے بابائے اردو کی شخصیت و سیرت کے بعض نمایاں اور ممتاز پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، شروع میں کچھ تعزیتی پیغام ہیں جن میں صدر ایوب اور ان کے سکریٹری شہاب قدرت اللہ کا پیغام قابل ذکر ہے، اور آخر میں ہند و پاک کے بلند پایہ علمی و ادبی رسالوں کے تاثرات نقل کیے گئے ہیں، اس لیے یہ نمبر بابائے اردو کے متعلق معلومات اور ان کی موت پر تاثرات کا بہت اچھا مجموعہ ہے،

سب رس امجد نمبر۔ کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۲۰، قیمت ۲؍ پتہ: ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد، دکن،

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کو حکیم الشعراء سید امجد حسین حیدرآبادی سے بڑا گہرا تعلق تھا، چنانچہ اس نے ان کی زندگی ہی میں ان کی شخصیت اور خدمات کے اعتراف میں اپنے رسالہ سب رس کا خاص نمبر شائع کیا تھا اور اب ان کی وفات کے بعد بھی ان کی یادگار میں یہ خاص نمبر نکال کر نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے، اس میں حضرت امجد کے حالات و سوانح کے ساتھ ان کے شعری و ادبی خدمات اور انکی غزل گوئی، رباعی گوئی اور نثر نگاری وغیرہ پر مختصر مگر جامع تبصرہ ہے، آخر میں وہ نظمیں ہیں جن میں مختلف شعرائے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، حضرت امجد حیدرآبادی صحیح معنوں میں حکیم الشعراء تھے، ان کی شاعری کی طرح ان کی شخصیت بھی بڑی پاکیزہ و دل آویز تھی، یہ نمبر ان دونوں کا مرقع ہے،

طبی ڈائجسٹ اجمل نمبر۔ مرتبہ حکیم محمد صلاح الدین نعمانی صاحب، صفحات ۷۵، متوسط سائز، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، قیمت ۷۵ نئے پیسے، پتہ دفتر ماہنامہ طبی ڈائجسٹ، مارکیٹ روڈ، حیدرآباد، پاکستان،

طبی ڈائجسٹ ایک طبی رسالہ ہے، جو حیدرآباد (پاکستان) سے نکلتا ہے، اس نے حکیم اجمل خاں مرحوم کی یادگار میں یہ نمبر نکالا ہے، اس میں حکیم صاحب مرحوم کی شخصیت کا جائزہ لیا گیا ہے، اور

ان کے کمالات، طبی خدمات اور فنی اجتہادات تحریر کیے گئے ہیں، ان کے قومی و ملکی خدمات، ان کی عظمت و شرافت اور اخلاقی بلندی وغیرہ مختلف خصوصیات کا بھی ضمناً تذکرہ کیا گیا ہے، حکیم صاحب مرحوم کی شخصیت ایسی جامع و ہمہ گیر تھی اور ان کے کارنامے اتنے گوناگوں ہیں کہ ایک نمبر میں ان کا احاطہ دشوار ہے، تاہم اس نمبر سے یہ فائدہ بھی کم نہیں کہ اس سے انکی یاد تازہ رہے گی۔

حاذق حسن وصحت نمبر - مرتبہ جناب حبیب اشعر صاحب۔ متوسط سائز، کاغذ، کتابت وطباعت معمولی، صفحات ۳۲۰، قیمت ۶ر پتہ: ماہنامہ حاذق ۲۲۷۶-اے فورٹ روڈ حضوری گیٹ، لاہور۔

حاذق بھی ایک طبی رسالہ ہے، اس نمبر میں حسن وصحت کے متعلق مضامین جمع کیے گئے ہیں، رسالہ کے شروع میں انسان کی زندگی میں حسن وصحت کی اہمیت بتائی گئی ہے، اور جسم اور کے مختلف اعضاء اور اس کی شکل وصورت وغیرہ کو حسین و توانا بنانے اور صحت و تندرستی کو قائم رکھنے کی تدبیریں تحریر کی گئی ہیں، اس کے بعد دنیا کی بعض حسین عورتوں کے سوانحی خاکے، چند حسینوں کے خطوط، پھر حسن وجمال کے متعلق اردو کے قدیم وجدید اساتذۂ فن کی نظمیں اور غزلیں دی گئی ہیں، اور آخر میں فلسفۂ جمال کے متعلق چند اچھے مضامین ہیں، اس نمبر کے مندرجات حسن وجمال کی طرح ہلکے پھلکے مگر دل کش ہیں، شروع کا حصہ طبی حیثیت سے خاص طور سے بہت مفید ہے، بعض مقالے خاصے معیاری ہیں، اس لیے یہ نمبر اپنی گوناگوں ادبی دلچسپیوں کے ساتھ صحت و تندرستی اور حسن وجمال کے تحفظ کا بھی نسخہ ہے۔

"ض"

مطبوعات جدیدہ

اردو تعلیم کے لسانیاتی پہلو - از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، صفحات ۸۴، کتابت وطباعت عمدہ، ناشر آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دلی ۶۔

ڈاکٹر نارنگ اہل علم کے حلقہ میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، ان کے قلم سے ادھر چند برسوں میں جو متعدد تحقیقی و علمی کتابیں نکلی ہیں ان میں یہ رسالہ بھی ہے، اس میں انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کسی زبان کے سیکھنے اور مہارت پیدا کرنے کے لیے محض اس زبان کے ذخیرۂ الفاظ کا حفظ کر لینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے صوتیاتی نظام اور قواعد، صرف ونحو سے بھی واقفیت ضروری ہے، اس کے بغیر آدمی کو بولنے اور لکھنے پر قدرت تو ہو سکتی ہے مگر اس میں مہارت اور اہل زبان جیسی بے تکلفی نہیں پیدا ہو سکتی، اردو زبان کی تعلیم میں عموماً ذخیرۂ الفاظ پر زور دیا جاتا ہے، اور یہ سلسلہ اعلیٰ تعلیم تک چلا جاتا ہے، حالانکہ طالب علم کو سب سے پہلے زبان کے صوتیاتی نظام اور اس کے قواعد سے واقف کرانا ضروری ہے، پھر اس حیثیت سے بھی اس کی اہمیت ہے کہ ہر دس بیس برس کے بعد الفاظ کے ذخیرہ کا ایک بڑا حصہ متروک ہو جاتا ہے، مگر زبان کا صوتیاتی نظام اور اس کے اصول و قواعد ہمیشہ اپنی جگہ قائم رہتے ہیں، یہ ایک خالص خشک علمی موضوع ہے، مگر ڈاکٹر نارنگ کی شگفتہ نگاری نے اس میں اچھی خاصی دل کشی پیدا کر دی ہے، یہ رسالہ بقامت کہتر و بقیمت بہتر کا مصداق ہے، اگر بعض فنی اصطلاحات کی دو دو جملوں میں تشریح کر دی جاتی تو اس کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا۔

یک رنگ و صد آہنگ ۔ از ڈاکٹر احمد اعظم ردولوی صفحات ۱۲۸، کتابت وطباعت بہتر، ناشر مصنف، پتہ: کتابی دنیا، نظیر آباد، لکھنؤ، قیمت ۶ؔ

یہ ایک جواں سال گرخوش ذوق شاعر کا مجموعۂ کلام ہے، پورے مجموعے میں صرف دو نظمیں اور بقیہ غزلیں ہیں، ڈاکٹر احمد کی شاعری کی عمر کچھ کم نہیں ہے، مگر ان کا دائرۂ تعارف ان کے مخصوص احباب تک محدود تھا، اس مجموعہ کے ذریعہ پہلی بار ان کا تعارف عام اہل علم میں ہو رہا ہے، ڈاکٹر احمد کو غزل گوئی سے فطری مناسبت معلوم ہوتی ہے، اور ان کی غزلوں میں تغزل کی تمام ہی ظاہری ومعنوی خوبیاں موجود ہیں، الفاظ کے حسن انتخاب، طرز بیان کی متانت، ترکیبوں کی جدت و موسیقیت اور تشبیہات کی ندرت کے ساتھ درد و سوز کی کیفیت اور معرفت و حکمت کی باتوں نے ان کی شاعری کو شراب دو آتشہ بنا دیا ہے، عقل و خرد کی کم سوادی و کم نظری اور عشق و محبت کی دیدہ وری و چارہ گری کے مضامین وہ خوب خوب باندھتے ہیں، اور ان میں بلا مبالغہ یک رنگ و صد آہنگ کا سماں پیدا کر دیتے ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

امرارِ محبت سے بیگانہ رہی دنیا   ارباب جنوں سی ہیں کچھ دیدہ وری آئی

یہ حسن کا عالم بھی مرہون جنوں نکلا   غنچوں کی بھی فطرت میں کچھ جامہ دری آئی

بکھرے ہوئے جلوؤں کے انداز سے یہ پوچھو   دیوانے کی قسمت میں کیوں دربدری آئی

اے جنت بنا دیتی ہے دورئ محبت کی   نشیمن ورنہ طومار خس و خاشاک ہوتا ہے

کرم کرے جنوں اس کو قبائے آگہی دے   لباس عقل آتا ہو نظر بوسیدہ بوسیدہ

ابھی ہے دور بہت منزل کمال جنوں   ابھی تو جیب و گریباں بھی تار تار نہیں

ان کی اکثر غزلوں کو پڑھ کر خواجہ میر درد کی عرفانی غزلوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، اپنی شاعری کے بارے میں انھوں نے بالکل صحیح کہا ہے

احمد میرے سخن میں تغزل بھی ہے مگر   طرز ادا و حسن بیاں عارفانہ ہے

امید ہے کہ یہ مجموعہ اہل ذوق میں کافی مقبول ہوگا اور اس کے مطالعہ سے موجودہ ذوق شعری میں جلا اور پاکیزگی پیدا ہوگی، البتہ اس ستھری مجموعہ کی ابتدا حمد و نعت کے بجائے رواج مجاز سے کچھ خلش سی پیدا کرتی ہے، اسی طرح لفظ "دربدری" بھی محل نظر ہے، محاورہ دربدر پھرنا ہے۔

حقوق الاسلام مع رسالہ سماع و مزامیر } از قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ ترجمہ وحید الدین سلیم پانی پتی، کتابت وطباعت عمدہ، ناشر پاک اکیڈمی (۱۴۲) وحید آباد گولی مار کراچی ۱۸۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ ان بزرگوں میں ہیں جن پر ہندوستان کو ہمیشہ فخر رہے گا، مرزا مظہر جانجاناں کی بزم عرفاں سے انھیں علم الہدیٰ اور شاہ عبد العزیزؒ کے آستان علم سے بیہقی وقت کا خطاب ملا تھا، تفسیر مظہری ان کے علم و فضل کا سب سے بڑا مظہر ہے، قاضی صاحبؒ کی کتاب مالا بد منہ آج چالیس پچاس برس پہلے گھر گھر پڑھی جاتی تھی اور بچوں کے نصاب کا لازمی جزء تھی، قاضی صاحبؒ نے جو اپنی تحریری یادگاریں چھوڑی ہیں ان میں یہ رسالہ بھی ہے، اس میں خدا اور رسول کے حقوق اور انسانوں کی تمام اصناف سے لیکر جانوروں تک کے حقوق کا ذکر ہے، ہندوستان میں اس موضوع پر غالباً یہ سب سے پہلی تصنیف ہے۔ قاضی صاحب کی دوسری تصانیف کی طرح یہ رسالہ بھی ان کے عالمانہ اور شستہ انداز بیان کا اعلیٰ نمونہ ہے، ترجمہ کے لیے وحید الدین سلیم پانی پتی جیسے صاحب علم و ادب کا نام ضمانت ہے، سماع و مزامیر پر بھی ایک رسالہ قاضی صاحب نے لکھا تھا، آخر میں وہ بھی شامل ہے، اس میں انھوں نے تمام فقہا، و محدثین کی رائیں نقل کرنے کے بعد سماع کے سلسلہ میں خود محاکمہ کیا ہے، اور نقش بندیوں کا یہ طریقہ نقل کیا ہے کہ نقش بندیوں نے وہ کام قرآن اور نماز اور ذکر و فکر سے لیا ہے جو اوروں نے گانے و بجانے سے لیا تھا، رسالہ ہر مسلمان کے پڑھنے کے لائق ہے۔

انسان اور اسکے مسائل ۔ از مولوی سید جلال الدین انصر عمری، صفحات ۴۰، کتابت وطباعت بہتر، ناشر مکتبہ جماعت اسلامی ہند، قیمت ۸ؔ

انسانی زندگی بے شمار اور گوناں گوں انفرادی و اجتماعی مسائل سے گھری ہوئی ہے، انہی

مسائل کے حل یا عدم حل پر اس کی صلاح و فلاح اور سکون و اطمینان کا مدار ہے، اس لیے ہر زمانہ میں انسانی دماغ نے ان مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی، مگر اس کے فکر کی رسائی مادی مسائل کے حل سے آگے نہ بڑھ سکی، انسان چونکہ اپنے مادی وجود کے ساتھ اپنا ایک اخلاقی وجود بھی رکھتا ہے جس کی ضرورتوں اور پیچیدگیوں تک انسان کا ذہن مشکل ہی سے پہنچ پاتا ہے، اس لیے وہ زندگی کے اس خلا کو بالکل ہی پُر نہ کر سکا، بلکہ انسان کی الجھنوں میں ان سے کچھ اور اضافہ ہی ہو گیا، یہ سعادت صرف خدا کے بھیجے ہوئے دین کو حاصل ہے، کہ اس نے انسان کے مادی اور اخلاقی دونوں وجودوں کے مسائل اور ان کی الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے، اور اس میں اسے اس لیے کامیابی ہوئی ہے کہ وہ دین خود انسان کے خالق کا بھیجا ہوا ہے، جو اس کے قلب و دماغ کے احساسات و جذبات اور ضروریات سے خود انسان سے بھی زیادہ واقف ہے، مولوی جلال الدین الضر صاحب نے انہی مسائل کا تجزیہ کر کے ان کا اسلامی حل پیش کیا ہے، بحث کا طریقہ فلسفیانہ نہیں بلکہ مصلحانہ ہے، امید ہے کہ اس کے مطالعہ سے ذہن کی بہت سی الجھنیں ختم ہو جائیں گی،

ترجمہ فیوض الحرمین - از مولانا عابد الرحمن صاحب صدیقی، ضخامت ۳۲۸ کتابت و طباعت متوسط، ناشر محمد سعید اینڈ سنز، قرآن محل کراچی، قیمت للعہ

شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب فیوض الحرمین کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ کی زبان صاف اور سلیس ہے، اگر اس کے انتخاب کا ترجمہ شائع کیا جاتا تو زیادہ مفید ہوتا، اس سلسلہ میں پاکستان کے ناشروں کو زیادہ توجہ دینی چاہیے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے علم و فضل کے ساتھ جو باطنی نعمتیں عطا کی تھیں، اس رسالہ سے اس پر کافی روشنی پڑتی ہے، یہ محض خواص کے مطالعہ کی چیز ہے۔

م ، ج

جلد ۹۰ ماہ جمادی الثانی ۱۳۸۲ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۶۲ء عدد ۵

مضامین

ایک ضروری اطلاع :-

معارف کے پاکستانی خریداروں کے لیے

پاکستان میں معارف کے جو خریدار ہیں اور وہ اس کا چندہ ہندوستان نہیں بھیج سکتے یا جو اپنے نام اب معارف جاری کرانا چاہتے ہیں، وہ اس کا سالانہ چندہ مبلغ ہے جناب سخی احمد صاحب ہاشمی لکچرار اردو سندھ یونیورسٹی حیدرآباد (مغربی پاکستان) کے یہاں جمع کر کے اسکی رسید دار المصنفین اعظم گڈھ کو بھیجدیں تو معارف ان کے نام جاری ہو جائے گا۔

"منیجر"